احمد شناس

ISBN: 81-88413-95-X

کتاب کا نام : پسِ آشکار
مصنّف : احمد شناس
پتہ : E-26، لین 5، توی وہار کالونی، سدھرا، جموں
فون 094191 11759, 0191-2662402

سال طباعت : جنوری 2010
تعداد : 1000
گرافکس : ڈاکٹر دلیپ کمار (بھاویکا گرافکس ودھاتا نگر جموں)
سرورق : ہردیپ سنگھ ''رنگ محل''، جموں
مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرینٹرز، دہلی
ناشر : ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

Communication Address
3871, 4th Floor, Kalan Mahal
Daryaganj, New Delhi-110002

Showroom
1645, Patuadi House
Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 9810784549, 9211532140

E-mail: abdus26@hotmail.com

Pas-e-Ashkar (Poetry)
by: Ahmed Shanas

Price: Rs. 300/- $ 12

پیش کش

دبستانِ ہمالہ

ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی
راجوری، جموں وکشمیر

Himalayan Education Mission Society
Rajouri, Jammu-185131, J & K
Contact Nos: 09419170902, 09419184689, 09797316229
E-mail: himalayan517@rediffmail.com

اهتمام

SPEC

سوسائٹی فار پیس اینڈ اینوائیرنمنٹل کنسرنز

۲۶/ای، توی وہار کالونی، سدھرا، جموں۔180019 جموں و کشمیر

Society for Peace & Environmental Concerns

C/o. 26/E Tawi Vihar Colony, Sidhra,
Jammu (J&K) Pin: 180019
Contact No. 09419111759
Email: shanas.jmu@yahoo.com

انتساب

خالقِ کائنات کے نام!

جس نے انسان کو لفظ و معنیٰ کا شعور عطا کیا

”جس نے علم سکھایا قلم سے
اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا“

— قرآن مجید

ع —

لفظ جب اُترا مِری آنکھیں منوّر ہو گئیں!

احمد شناس

پیش کلام

— محمد یوسف ٹینگ

احمد شناس کشمیر میں اُردو سُخن گویوں کی چوتھی پیڑھی کا حصہ ہیں۔ پہلی پیڑھی درآمد کی تھی اور اُس میں نوآبادیت کی تسخیر کا طنطنہ تھا۔ خوشی محمد ناظرؔ اِس دور کے عنوان ہیں۔ پھر رسا جاودانیؔ اور میر غلام رسول نازکیؔ جیسے شعرا نے دوسری پیڑھی کی سیڑھی اُستوار کی۔ اور اِس کو پھلا نگتے ہوئے بڑے مکتب سے جُڑ جانے کے جتن کیے۔ لیکن اپنی آواز کو صحراؤں میں بھٹکتا دیکھ کر اپنی مادری زبان کے پچھواڑے میں کُود گئے اور اعتبار و اِستناد کی کچھ نقدی اپنی ہتھیلیوں میں کھنکانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اُن کے بہت سے سنگی ساتھی اِس قدر خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے اور وہ پار اُترنے کی تگ و تاز میں گم نامی کے سمندر میں ڈوب گئے۔ تیسری نسل عابدؔ مناوری سے ایرج کاشمیری اور حکیم منظورؔ سے پرتپال سنگھ بیتاب تک اُردو سخن سرائی کے بڑے دھارے سے جُوجھتی رہی۔ اِنھیں اُردو نگری کے نواحی جزیروں میں لنگر انداز ہونے کے پروانہ ہائے راہ داری بھی مِلے اور یہ بڑی کامیابی تھی۔

لیکن چوتھی نسل جو ابھی گنگناہٹوں کے جھٹپٹے سے نِکل کر نمود اور وجود کا اِنعام حاصل

کرنے کے لیے شب خون پر اُتر آئی ہے۔ اُردو کے میمنہ اور میسرہ میں نہیں بلکہ قلب لشکر میں اپنے قلم کی شمشیریں چمکانے میں مصروف ہے۔ میں رفیق رازؔ کی مانند ''پسِ آشکار'' کے شاعر کو اِسی نسل کے نمائندوں میں شمار کرتا ہوں۔

اس نسل کا پسینہ گُلاب ہو یا تیزاب، یہ اُردو سخن گوئی کی مجموعی مہک سے ہم آہنگ ہے۔ اِن کے ہاں لفظ کی گرامر سے زیادہ اُس میں پوشیدہ پیکر کو اُبھارنے کی جستجو ملتی ہے۔ اور یہ لہر اُردو کی منجدھار سے اُبھرتی ہوئی لگتی ہے۔ اِس لیے زیرِ نظر مجموعے کے شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو اِس کے اچھے اشعار کے ارتعاشات کو ہندو پاکستان کے اچھے اُردو شاعروں سے منسوب کرنے میں بہت تامل نہیں کرنا پڑے گا...... مُنیرؔ نیازی سے ندؔا فاضلی تک۔ اِس جسارت کے لیے جان کی امان چاہنے کے لیے کس بل کی ضرورت نہیں۔

ہونے کا اعتبار کھِلے پُور پُور میں
بانہوں کا تنگ دائرہ دستِ دُعا مِلے

وہ صدائیں دیتا ہے آخری جزیرے سے
اور ہم نِگاہوں کا حُسنِ ابتدا مانگیں

پانی اُتر گیا تو زمیں سنگلاخ تھی
تیکھا سا ہر سوال تھا رانجھے سے ہیر کا

تیری اذاں کے ساتھ میں اُٹھتا ہوں پو پھٹے
سر میں لیے ہوئے کوئی سجدہ اسیر کا

اِس طرف حاجت کے موسم اور محرومی کے رنگ
اُس طرف دیوار کے خوابوں کا منظر رکھ دیا

یہ شعر کتاب کے پہلے ہی صفحوں سے پہلی نظر میں ہی چُنے گئے ہیں۔ کتاب کے جیب و دامن کو ٹٹولیں تو زیادہ تابدار موتی اُٹھائے جاسکتے ہیں۔ یہ صرف شاعر کے ذاتی اِمکان کا اِشارہ ہی نہیں بلکہ اُس فضا کی توسیع کا بھی اِستعارہ ہے جس نے ہمارے زمانے کو اُڑتے ہوئے بادلوں میں جلتی بجھتی کرنوں کی تگ و تاز کا آسمان بنایا ہے۔ آج سُخن سرائی زمینی نِداؤں اور صداؤں کو آسمان جیسے کھُلے گنبدِ بے بام و در میں رواں رکھتی ہے۔ مرزا غالبؔ کے فردوس اور دوزخ کی مِلی جُلی اور کھُلی فضا میں سیر کرنے کا خواب پورا ہوسکے گا یا نہیں مگر ہم عصر شاعر نے ابر کے بادباں کا پلو پکڑ کر معاملات کو ایک بے سرحد کی پہنائی بخشی ہے اور کیفیت کے لحاظ سے اس میں جنت اور جہنم دونوں کا لمس محسوس کیا جاسکتا ہے۔

پاپ دھماکے میں ہم بھگتی ڈھونڈھ رہے ہیں
میڈونا کے خط و خال میں میرؔا دیکھیں

سوچتی ہی رہ گئیں آنکھیں کنارے پر کہیں
حُسن بالآخر حدِ اِمکاں سے باہر ہو گیا

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی سُن مجھے

آخری شعر میں کتاب سے لُڑھک جانے کے بعد معنی کے آبِ حیات کی تلاش میں ایک ایسی نارسائی کا اظہار ہے جو ذات و کائنات کے اَن سُنے اسرار کو سماعت کی خیرات بخشنے اور

پھر اُس سے درود کی مُنوّر گونج پیدا کرنے کی سوالی ہے۔ یہ ایسے میل پتھر ہیں جہاں زمینی خطوں کی مٹی کے مقامی رنگ ایک بڑے کینوس میں حل ہو کر ایک رنگا رنگ لینڈ اسکیپ اُبھارتے ہیں۔ اقبالؔ کے مصرعے ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' کے اِشارے میں مُضمر فنکار کی تخلیق خداوندی کے ننھے منھے کھِلونے...... یادش بخیر۔

مجھے اِس مجموعے کے اشعار پڑھتے ہوئے ایم. ایف. حسین کی خوبصورت مگر ریزہ ریزہ فلم 'گج گامنی' یاد آگئی۔ جہاں مادھوری دیکشت جیسی مستِ شباب، صوفیانہ لے میں اسراری شاعروں کے نغمے چھیڑتی ہے اور پھر اُن پر گج راج کے پر تمکنت خرام کی شان دکھلاتی ہے۔ رنگ مدہم مگر میٹھے۔ سُر کم کم مگر رسیلے۔ اس مجموعے میں بھی آواز کہیں Decible کا تناسُب نہیں توڑتی۔ مگر آرکسٹرا کا سا سماں پیدا کرتی ہے۔ کومل سُروں اور نازک سازینوں کا نغمہ ایک لطیف ہالہ بُنتا ہے اور اشعار کی نوکیلی چبھن کو اِس طرح سہارتا ہے جیسے سرجن کا نشتر انسیتھزیا سے نیم بے حس انگ کو چیرتا پھاڑتا ہے۔

لفظ جب اُترا میری آنکھیں مُنوّر ہو گئیں
لفظ احمدؔ زندگی سے رابطے کی ڈور ہے

اُتری نہ کسی آنکھ میں آنسو کی ایک بوند
اس دھوپ میں جھُلس گیا دوہا کبیر کا

میری راہوں میں جگنو دیپ رکھ دے
مُسافر راستہ بھولا ہوا ہے

اُس نے مجھ سے میری ذات کا پورا حصّہ مانگا تھا
اور مجھے درپیش رہا ہے سانسوں کا گرداب سفر

مجھے اِس مجموعے کی ترتیب کا ماجرا نہیں معلوم۔ لیکن ایسا لگا کہ یہ شاعر کے بسیارِ کلام کا بڑا محتاط انتخاب ہونا چاہیے کیونکہ اِس میں ایسے کم شعر ملیں گے جو حواس کے گیس چیمبر میں چنگاریاں نہ ڈالیں۔ اِن اشعار میں سے بیشتر سے سرسری گُزر جانا مُشکل ہے۔ اِن میں محاورے سے زیادہ لہجے پر زور ہے۔ لیکن اِن کی خصوصیت (اسلُوب کا لفظ ابھی کچھ بوجھل سمجھا جائے گا) پیکروں کی ندرت، اظہار کی کفایت بلکہ Understatement اور مناظر کی بوقلمونی ہے۔ شاعر نے مقامی حوالوں سے درگزر نہیں کیا ہے کہ کشمیر اب اپنے قُدرتی حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ موجودہ جدال وقتال کے لیے بھی ساری دُنیا میں اپنی الگ شناخت منوا چکا ہے۔ شاعر کشمیر کی مٹی کو مُٹھی میں لے کر اِس کی بُو باس کو شعر کے رگ و ریشے میں inject کرتا ہے۔ تو اس میں انفرادی دُکھ درد کے ساتھ بڑے اِنسانی کرب کی لہریں مچلتی ہیں۔ ایسے اشعار کے اندر کشمیر کے زخم لو دیتے ہیں۔ لیکن اِنہیں اس سے بڑے تناظر کے ساتھ جوڑنے میں بھی کوئی مُشکل نہیں ہوتی۔ اِس وقت دُنیا میں نرم جذبات، اچھی قدروں اور بڑے آدرشوں کی جو شکست و ریخت ہو رہی ہے وہ جیسے روحانی سطح پر ایک سونامی (Tsunami) کی گرج کا سُراغ دے رہے ہیں۔ اِس کی آہٹ اِن اشعار کے تٹ پر بھی سُنائی دیتی ہے۔

اُس کی تقریروں میں ہے جامِ شہادت کا نشہ
اور گھر میں زندگی کا خوب صورت مور ہے

زعفرانی کھیتوں میں اب مکان اُگتے ہیں
کس طرح زمینوں سے دِل کا رابطہ مانگیں

ہم خریداروں کی اندھی بھیڑ میں گُم ہو گئے
بھاؤ جس کے ہاتھ میں تھا وہ سکندر ہو گیا

میں بات کرنے لگا تھا کہ لفظ گونگے ہوئے
لُغت کے دشت میں کس کو صدا لگاؤں گا 'ماں'

اِس مجموعے کی نظمیں چند ہی ہیں۔ لیکن ''کشمیر'' نظم میں روایتی اِظہار سے اِنحراف بہت خوب لگتا ہے۔ کشمیر کا حُسن و جمال انگریزی محاورے کے مطابق اُتنا ہی کہن سالہ ہے جتنے ہمارے پہاڑ۔ بات تو وداع و وصل کی طرح وہی پُرانی اور پراچین ہے۔ لیکن احؔمد کے یہاں اُس کا انداز قدرے مختلف اور انفرادی ہے۔ چند مصرعے ۔

کبھی جو اپنا جوہر تو نے اِس مٹی کے سینے میں چھپایا تھا
اُسی کا نام اب کشمیر کا منظرِ حسیں ہے
کبھی تو نے بھی شائد دیکھنا چاہا تھا خود کو
اِس لئے اِن وادیوں کا ذرہ ذرہ آئینہ ہے
خداوندا میرے حرف و بیاں کی کشتیاں
اِس رنگ و کیفیت کے تا حدِ نظر پھیلے ہوئے ساگر میں آ کر ڈوب جاتی ہیں
دکھائی تو نہیں دیتا مگر محسوس ہوتا ہے کہ تو کتنا حسین ہے!

اور پھر اِس حمدیہ تشبیب کے بعد گُریز۔ نظم کو پڑھیے اور حفیؔظ جالندھری کی تلخئ بہ شیریں کی معنویت محسوس کیجیے۔

احمؔد شناس کا یہ مجموعہ ایوانِ اُردو میں ہماری ریاست کے کسی شاعر کی دستک نہیں بلکہ

آمد(Arrival) کا اعلان ہے۔اور کتنی ستم ظریفی ہے کہ یہ نوید اُس وقت دِل کو چھوتی ہے جب خود ریاست میں اُردو کا دیا مُفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹمارہا ہے۔اُردو کے وضعداروں کو محاورے اور تذکیروتانیث کے دوہتڑ ڈھونڈنے کی حاجت نہیں کہ اِس مجموعے کا انداز اور آواز اُس کے بڑے دھارے کے تاثر سے بس بالشت بھر ہی کوتاہ ہے اور ریاست میں اُردو کی بجھتی ہوئی روشنیاں دیکھنے والے ہم کشمیریوں کے لیے......

ع طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار

احمد شناس — 'پسِ آشکار' کے حوالے سے

— پرتپال سنگھ بیتاب

ڈوگرہ حکومت کے زمانے سے اُردو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان چلی آ رہی ہے۔ اِس تعلق سے ریاست کے مختلف خِطوں کی اپنی اپنی علاقائی زبانیں ہونے کے باوجود اُردو یہاں کی عام بول چال کی زبان ہے یعنی Lingua Franca ہے۔

پونچھ راجوری ریاست کا ایسا علاقہ ہے جس کا تعلق اُردو ادب کے ساتھ بہت گہرا رہا ہے۔ چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ٹھاکر پونچھی جیسے بڑے ناموں کے علاوہ متعدد چھوٹے بڑے اُدبا و شعرا کا تعلق اِس علاقے سے ہے۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جہاں پورے ہندوستان میں جدید ادب کی ایک نسل منظرِ عام پر آئی وہیں راجوری کے علاقے میں فاروق مضطرؔ، احمد شناسؔ، خورشید بسملؔ وغیرہ نے بالکل نئے انداز میں شعر و ادب کی دُنیا میں قدم رکھا۔ فارُوق مضطرؔ اور احمد شناس حالاں کہ نسبتاً زیادہ فعال اور پُر اُمید شاعر تھے لیکن بوجُوہ جہاں فاروق مضطرؔ کے شعری سفر

میں تعطل آ گیا وہیں احمد شناس اندر خانے تخلیق شعر میں مشغول رہے لیکن اپنا کلام رسائل وغیرہ میں چھپوانے اور مجموعہ وغیرہ شائع کروانے کے معاملے میں وہ بھی قدرے تساہل کا شکار رہے۔ حالاں کہ اِن دونوں کے ہاں بلا کی شعریت اور نُدرت نمایاں رہی ہے۔

خوش گوار حیرت ہوئی جب دیر آید درست آید کے مصداق احمد شناس نے پچھلے تیس چالیس برس پر محیط اپنے کلام کو ترتیب دینے کا مژدہ سُنایا۔ میں خود بھی احمد شناس اور فاروق مضطر کا ہم عصر ہوں اِس کے باوجود احمد شناس نے مجھے اِس قابل سمجھا کہ میں اُن کے زیرِ ترتیب شعری مجموعے ''پسِ آشکار'' پر دیباچے کی صورت میں چند حروف لِکھ دُوں۔ اِس بیتاب نوازی کے لیے میں احمد شناس کا شکر گزار ہوں۔

راجوری ایک ایسا علاقہ ہے جو اُردو کے نام نہاد مرکزی دھارے (Main stream) سے بالکل الگ تھلگ دِل کش پہاڑوں میں واقع ہے۔ احمد شناس نے اس دُور افتادہ علاقے سے ہوتے ہوئے بھی بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے شعری منظر نامے پر موجود رہے۔ اگر اِس بیچ احمد شناس کا کلام رسائل و جرائد وغیرہ کے ذریعے قارئینِ اُردو ادب تک تواتر سے پہنچا ہوتا تو یقیناً آج وہ ملک گیر سطح پر معروف و معتبر شعرا میں شمار ہوتے۔ میرے اِس قول کا ثبوت ''پسِ آشکار'' کے ہر صفحے پر خوبصورت اشعار کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

احمد شناس کی شاعری پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے برف سے ڈھکے ہوئے اُونچے پہاڑوں پر مسلسل دھوپ کھِلنے کے باعث صاف و شفاف پانی نیچے کی طرف بہتا ہوا آبشاروں، چشموں، نالے ندیوں کی صورت نمایاں ہو رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میری کیفیت سے بنتے ہیں زمیں کے خد و خال
میں جو اندر سے ہوا خالی تو باہر شور ہے

کبھی تو آخرِ شب پھول، سا کھل میرے آنگن میں
کبھی میرے نواحِ جسم میں خوش بوئے جاں ہو جا

میری راتوں کو قطرہ قطرہ شبنم بانٹنے والے!
کبھی مانندِ دریا میری آنکھوں سے رواں ہو جا

ریاست جموں و کشمیر ایک کچّی لکیر کے آر پار ہندوستانی اور پاکستانی علاقے میں بٹ گئی۔ ریاست کے باشندوں کے اندر یہ کچّی لکیر اکثر خار کی طرح چُبھتی رہی ہے۔ خاص طور سے جو لوگ اِس لکیر کے عین آر پار بسے ہوئے ہیں اُن کے درد کی بہترین تصویر دیکھئے:

پکّے حروف گرد کی صورت بِکھر گئے
سینے میں گھاؤ رہ گیا کچی لکیر کا

جدید ادب کی نئی پود جو بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں پُورے ملک کے الگ الگ مختلف خِطوں سے بیک وقت ابھر کر سامنے آئی اُس کے کلام میں ایک ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دیکھئے جموں و کشمیر کے علاقہ راجوری کا اُس عہد کا شاعر کیا کہہ رہا ہے:

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کِنارہ ہی مُجھے
اُس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

میں سامنے ہوں وہ میرے اندر چھپا ہوا ہے
میں اُس کی تخلیق ہوں وہ میرے خیال جیسا

معاشروں کے سامنے کئی بار ایسے مراحل آجاتے ہیں جب اپنے اجتماعی اعمال پر ندامت ہونے لگتی ہے۔ شاعر کئی بار اجتماعی شرمندگی کو اپنے اوپر لیتے ہوئے اُسے خوب صورت شعری جامہ پہنا دیتا ہے۔ احمد شناسؔ کے یہ اشعار دیکھئے:

نہیں پہچانتا اب آئینہ تصویر میری
مِٹا ڈالے ہیں جیسے خود میرے آثار میں نے

پھر اُس کے بعد پتھر ہو گیا آنکھوں کا پانی
جب اپنے غم میں رونے سے کیا انکار میں نے

ہوا آتی نہیں صحرائے دِل کی گھر میں احمدؔ
اُٹھائی اِس طرح کچھ شہر کی دیوار میں نے

احمد شناسؔ کے ہاں کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے غالبؔ کا اسلوب وبیاں یاد آجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ابھی کچھ حُسن باقی ہے ہماری آنکھ میں احمدؔ
کہ پتھر اُس نے پھینکا اور ہم نے آئینہ دیکھا

گھر کسی خواب کی مشعل سے ابھی روشن ہے
دیدنی ہے ابھی اُمید کی چھب آنگن میں

مناظر کو بہت مُدت ہوئی ہے
نِگاہوں میں نیا اِک باب دیکھے

بدن تو ایک مُشتِ خاک سا ہے
یہ مُجھ میں کون بے ارض و سما ہے

کئی بار سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ نئی نسل کے فوراً بعد منظرِ عام پر آنے والی نسل کے ہاں جدید فکر و اسلوب سے الگ کیا ہے؟ میرے خیال میں نئی نسل نے عصری حِسیت کو جس طرح سے نئی حسیت کے شانہ بہ شانہ رکھا ہے، نسلِ جدید کے ہاں وہ بہت کم بلکہ قریب قریب مفقُود ہے۔ احمد شناسؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

سہمگیں راتیں بتانے کے لیے جائیں کہاں
دستکیں خاموش، گھر ویران، درگاہیں اُداس

گھر سے جب نکلا تھا میں سرسبز تھیں پگڈنڈیاں
اب میرے گھر کی طرف جاتی ہیں سب راہیں اُداس

مٹانا چاہتا ہے کیا سمندر
ہوا نے ریت پر کیا لکھ دیا ہے

ساتھ ہو لیتا ہے ہر شام وہی سناٹا
گھر کو جانے کی نئی راہ نکالی جائے

جو دِکھایا جا رہا ہے بس وہی کچھ دیکھئے
پردہِ سیمیں کے پیچھے جھانکنا اچھا نہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں جو خالص عصری حسیّت نظر آتی ہے وہ بھی نئی نسل کا خاصہ ہے۔ یہ عنصر بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں سامنے آنے والی جدید پود کے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے:

ہر دوسرے قدم پہ مُجھے اِنتظار ہے
بجلی جھلک دکھائے کہیں راستہ ملے

کِتابیں اپنے سینوں سے لگا رکھی ہیں لوگوں نے
مگر لفظوں کو ہم نے شہر میں جلتا ہوا دیکھا

احمد شناسؔ کی غزلوں میں مذکورہ عوامل کے علاوہ اور بھی بہت سے گوشے ہیں جِن پر روشنی ڈالنے کی گنجائش ہے لیکن اِس طرح قاری کے انفرادی اندازِ افہام وتفہیم کے غیر ضروری سطح تک متاثر ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ لہٰذا احمد شناسؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کے ساتھ ''پسِ آشکار'' کو قاری کے حوالے کیا جاتا ہے:

جو سمندروں سا وِشال تیرا لگاؤ ہے
تو کِسی جزیرۂ حُسن پر مجھے دیکھنا

میں لفظوں کی نئی فصلیں اُگاؤں
وہ سناٹوں کے تازہ خواب دیکھے

تمہاری قربت کی وادیوں میں کِسے خبر تھی
کہ اِک نئے زخم زار کا انکشاف ہوگا

سب سے پہلے تو نے میرے لفظوں کو مہکایا تھا
پہلی بار جگایا تو نے اِن آنکھوں میں خواب سفر

اپنا خیال اوڑھ کے سوتا ہوں رات کو
پھر صبح کو جگاتی ہے اپنی ہی دُھن مجھے

احمد شناسؔ نے ''پسِ آشکار'' میں کچھ نظمیں بھی شامل کی ہیں۔ حالاں کہ ایک طرح سے احمد شناسؔ کے اشعار کے ساتھ ''پسِ آشکار'' کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن کی نظمیں بجائے خود ''پسِ آشکار'' میں اضافی حیثیت کی حامل ہیں۔ خاص طور سے کشمیر، بلا عنوان، آیتوں کا دیدہ ور، نظمیں نئی نظم کے باب میں بہت خوش گوار اضافہ ہیں۔

''پسِ آشکار'' قارئین کے سامنے ہے۔ پُوری اُمید بلکہ یقین ہے کہ شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

کچھ اپنے بارے میں—

احمد شناس

ادب ہمیشہ اُن زبانوں میں پروان چڑھا کرتا ہے جن کی پشت پر ایک توانا علمی، اخلاقی اور تاریخی روایت ہوا کرتی ہے اور جو اس حوالے سے انسانی فکر کو متحرک کرنے والی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تہذیبی، تاریخی یا علمی سرمایے کے پوشیدہ گوشوں کو آشکارا کرنے کا کام ایک اچھے استاد کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جن زبانوں میں اچھے استاد میسر ہوتے ہیں وہ ہمیشہ فکری طور پر فعال طالب علموں کو جنم دیتی ہیں۔ اور یہی طالب علم اچھا ادب پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگرچہ تخلیقی صلاحیتیں ہر شخص کا انفرادی حصّہ ہے۔ مگر اچھے استاد کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ طالب علم کے اندر پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو نہ صرف دریافت کرتا ہے بلکہ اُن کی آبیاری بھی کرتا ہے۔

اُردو زبان وادب کے ساتھ خطۂ راجوری، پونچھ کو جو تاریخی نسبت رہی ہے، اس کا تجزیہ اگر اس پس منظر میں کیا جائے تو یقیناً ہمیں استاد اور طالب علم کے باہمی ربط کی بے شمار ان کہی کہانیاں مل جائیں گی۔ راجوری پونچھ کے اندر اُردو زبان وادب پڑھنے اور

پڑھانے کی ایک شاندار اور جاندار روایت رہی ہے۔ اور ایسی روایتیں ہمیشہ زندہ رہا کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ جدید تعلیم کے علمبردار English medium اسکولوں کی چاروں طرف ایک یلغار ہے، راجوری پونچھ کے اندر اُردو پڑھنے اور اُردو میں لکھنے والوں کی تعداد میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جدید تعلیم ابھی تک ان علاقوں میں کوئی Singnificant impact بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ بہر کیف یہاں میں یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ جہاں تک راجوری پونچھ کے اُردو تخلیق کاروں کا تعلق ہے وہ نئے یا پرانے سب کے سب صرف لیلائے شاعری کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ جب کہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ اب ہمارے نئے تخلیق کار دوسرے ذرائع اظہار میں بھی نہ صرف طبع آزمائی کریں بلکہ نمایاں کام کریں۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ پچھلے کچھ عرصے سے ہمارے علاقوں میں مقامی زبان و ادب کو بڑھاوا دینے کی جو پُر زور تحریکیں چل رہی ہیں وہ اپنی تمام تر سیاسی طاقت کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ کیوں نہیں برآمد کر سکیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی اسی بات میں ہے کہ مقامی زبانوں کے ساتھ کیوں کہ کوئی جاندار تاریخی یا تہذیبی روایت وابستہ نہیں ہوتی اس لیے وہ فکری طور پر انسان کو متحرک نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا مقامی زبانوں میں کوئی اعلیٰ ادب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف راجوری پونچھ بلکہ کسی بھی دوسرے علاقے کے ادبی منظرنامے پر نظر ڈالیے آپ کو اس بات کی تائید مل جائے گی۔

بہر حال اس پس منظر میں جب میں خود اپنے ادبی سفر کی کہانی کے تانے بانے جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو لامحالہ مجھے اپنے ایک استادِ محترم کی یاد آ جاتی ہے۔

میری پیدائش ضلع راجوری کے ایک گاؤں شاہدرہ شریف کی ہے۔ اسکول کی تعلیم پرائمری اسکول شاہدرہ شریف سے شروع ہو کر ہائی اسکول تھنہ منڈی میں مکمل ہوئی۔ یہ

۱۹۶۰ء کی دہائی کا زمانہ تھا۔ جب کہ زبانوں کے حوالے سے انگریزی زبان کے استاد تو ہمیشہ باہر سے آیا کرتے تھے۔ اس لیے خال خال ہی میسر ہوتے تھے۔ مگر اُردو کے استاد چونکہ مقامی طور پر مل جایا کرتے تھے۔ اس لیے اُردو میں طالب علموں کی کارکردگی ہمیشہ اطمینان بخش ہوتی تھی۔ اسکولوں کے ساتھ ساتھ چونکہ دینی مدارس میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی ایک روایت تھی، اس لیے اُردو زبان کے حوالے سے طالب علم کے پاس زیادہ بہتر ماحول تھا۔ جس دینی مدرسے میں، میں نے تعلیم حاصل کی تھی وہ باقی مدرسوں سے قدرے مختلف تھا۔ اس لیے کہ اس کے مدرس یعنی ہمارے اُستادِ محترم مرحوم مولوی محمد عالم صاحب عام مدرسین سے ذرا مختلف واقع ہوئے تھے۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ علامہ اقبال کی شاعری کے ساتھ والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔

درحقیقت برِّصغیر کی ادبی شخصیات میں علامہ اقبآل ہی وہ واحد شخصیت ہیں جنہیں معاشرے کا ہر طبقہ اپنا شاعر سمجھتا ہے۔ ان کے اشعار جہاں ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں کے لیے ذہنی غذا مہیا کرتے رہے ہیں وہیں سیاست دانوں اور مولوی حضرات کا لہو گرم رکھنے کا شاندار بہانہ بھی رہے ہیں۔ اور یہ بات آج بھی اتنی ہی سچ ہے جتنی کہ کل تھی۔ بلکہ ہمارے عہد کا المیہ تو یہ ہے کہ آج دانش کدوں میں تو اقبآل کی فکر کی لو تقریباً بجھ چکی ہے۔ مگر سیاسی ایوانوں اور مذہبی اِداروں کے اندر اقبآل کے پُر جوش اشعار کا غلغلہ تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔

بہرحال میں اپنے استادِ محترم مولوی محمد عالم صاحب کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ ایک پُر وقار شخصیت کے مالک، باذوق انسان تھے۔ علامہ اقبآل کی شاعری کے دلدادہ اور اُن کے شعروں کی داد اپنی مترنم آواز میں دیا کرتے تھے اور بچوں کو بھی آواز میں آواز ملانے کی تربیت دیا کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں انھوں نے میری اور میرے ایک اور ساتھی

عبدالرشید شاہین کی آواز میں خوش الحانی کا وہ گوہرِ مراد پالیا جس کی انھیں تلاش تھی۔اس کے بعد وہ ہمیں کلامِ اقبال کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کی باقاعدہ ٹریننگ دینے لگے۔ پھر کیا تھا، رفتہ رفتہ ہم محفلوں کی جان بن گئے۔ غیر رسمی محفلیں ہوں یا سیاسی جلسے، مولوی صاحب ان کا آغاز ہمیشہ ہماری آواز میں کلامِ اقبال سے کرواتے تھے۔اس طرح ہماری آواز کے ذریعے مولوی صاحب نے محفلوں کو گرمانے کا خوب کام لیا، جس کے لیے ہمیں داد بھی ملتی تھی اور کبھی کبھی انعام بھی مل جایا کرتا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو کسی بھی حساس ذہن پر اپنے اثرات مرتب کیے بنا نہیں رہ سکتا چنانچہ شعری آہنگ میرے لاشعور کا حصّہ بن گیا اور لفظوں کی قطع و برید کو میں نے اپنا مشغلہ بنالیا۔

میرے ساتھی عبدالرشید شاہین نے اسکول کی تعلیم مکمل کر کے سرکاری نوکری جوائن کرنے کا فیصلہ کرلیا اور میں نے گیارھویں جماعت میں ڈگری کالج پونچھ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کورس کی کتابوں کے علاوہ جو شاعری کی کتاب مستقلاً میرے مطالعے کا حصّہ رہی وہ علامہ اقبال کی ''بالِ جبریل'' تھی۔ کالج میں ہمارے اُردو کے استاد مرحوم اجیت کمار بخشی صاحب اور فارسی کے استاد محمد شفیع صاحب تھے۔ دونوں اپنے مضامین پر گہری نظر رکھنے والے پیشہ ور استاد تھے۔ان دونوں کی کوششوں سے کالج کے پہلے اُردو میگزین کا اجرا ہوا اور اس کے علاوہ کالج کے اندر کچھ یادگار مشاعرے بھی منعقد ہوئے۔یہیں سے میں نے باقاعدہ ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔جن اشعار کے ساتھ میں نے کالج کے پہلے مشاعرے میں شرکت کی تھی، ان کی نوک پلک سنوارنے میں مرحوم اجیت کمار بخشی نے میری مدد کی تھی۔

کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا تو یہ 1970 کی دہائی کا زمانہ تھا۔ جب کہ اُردو ادب کے اندر جدیدیت کا دور دورہ تھا۔ ''شب خون'' نے اُردو ادب کے محاذ پر جو شب خون مارا تھا اس سے ادبی حلقوں کے اندر خاصی بے چینی کا ماحول تھا۔ جیسا کہ روایتی سوچ کا بُت ٹوٹنے پر اکثر ہوا کرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''شب خون'' کے قارئین کا حلقہ تمام اطراف میں پھیلتا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ راجوری سے فاروق مضطرؔ اور میں ''شب خون'' کے پہلے قاری تھے جو بعد میں اپنے جدید رنگ کے اشعار کے ساتھ جموں کے ادبی حلقوں میں نمودار ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ان حلقوں میں ہماری پذیرائی ویسی ہی ہوئی جیسی کہ ہمیں توقع تھی۔ تاہم، ہم نے حوصلہ نہیں ہارا اور اپنی دھن میں شعری تجربات کرتے رہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں میرے ہم عصر لکھنے والوں میں فاروق مضطرؔ کی حیثیت نمایاں تھی کیوں کہ انھوں نے جدید طرزِ اظہار کے ساتھ اچھی خاصی ذہنی ہم آہنگی پیدا کر لی تھی اور پھر شاعری کے حوالے سے ان کے اندر بلا کا جنون تھا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ شاعری کی دنیا کا یہ راہ نوردِ شوق اور تخیلات کے صحراؤں کا مجنوں ایک دن عمل کی دنیا کا فرہاد بن کر جوئے شیر کا پہاڑ کاٹتا ہوا نظر آئے گا۔ جیسا کہ تعلیم و تدریس کے میدان میں فاروق مضطرؔ نے راجوری کے اندر کیا اور پھر یہی اُن کی زندگی کا مِشن (Mission) بن گیا۔ یہاں تک کہ لیلائے شاعری کو واپس مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں نکال پائے۔ فاروق مضطرؔ زندگی میں واقع ہونے والی ناقابلِ قیاس تبدیلیوں کی ایک مثال ہیں اور ایسی تبدیلیاں مجھے بہت fascinate کرتی ہیں۔ فاروق مضطرؔ کے بارے میں ایک سچائی یہ بھی ہے کہ اُن کے اندر کا شاعر آج بھی زندہ ہے اور اپنی روح کی پیاس بُجھانے کے لیے نِت نئے وسیلوں کی تلاش میں ہے۔ اِس حوالے سے اُن کے قائم کردہ دَبستانِ ہمالہ کی

سرگرمیاں قابلِ داد ہیں۔

بہر حال وقت گزرتا گیا اور سال 1978ء میں، میں نے آل انڈیا ریڈیو کی نوکری اختیار کرلی جو سات سال کے عرصہ پر محیط رہی اور جس کا خاتمہ سال 1984ء میں ہوا جب کہ میں نے Kashmir Administrative Services کا امتحان پاس کر کے ریاستی حکومت کی ملازمت جوائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو کی نوکری کے دوران جو وقت میں نے شعری کاوشوں کے اندر صرف کیا وہ شاعری کے ساتھ میری strong commitment کا زمانہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ میں نے اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ لکھا اور جو کچھ لکھا وہ نامور جریدوں اور رسائل میں شائع بھی ہوتا رہا۔ خاص کر علی گڑھ سے شائع ہونے والے جریدے ''الفاظ اور اِنکار'' میں جنہیں ابوالکلام قاسمی صاحب Edit کیا کرتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پسِ آشکار میں شامل زیادہ تر کلام اسی زمانے کا ہے۔ بہر حال جیسا کہ ہر climax کا ایک anti climax بھی ہوتا ہے۔ ریڈیو کی نوکری کے آخری ایام میں میرے ذہنی اُفق پر جو تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئی تھیں ان کو دیکھ کر مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید میرے شعری سفر کے anti climax کا آغاز ہو چکا ہے۔

قدرت نے انسان کے اندر تغیر پذیری اور ردو قبول کے جو امکانات رکھے ہیں، انسانی فہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور کبھی کبھار جب یہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

انسان، انسان کو ہمیشہ اپنے بنائے ہوئے پیمانوں سے ناپتا ہے۔ اس کے ذہن میں اُن پیمانوں کے کچھ متعین نام ہوتے ہیں اور کچھ متعین شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ ایک متعین شناخت کے باہر جا کر انسان کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کیوں کہ اس سے اس کے خودساختہ

نظریات اور خود تراشیدہ عقیدوں کے بُت ٹوٹنے کا ڈر ہوتا ہے۔لہٰذا وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ انسان کو کچھ متعین ناموں کے حوالے سے ہی دیکھتا رہے۔ ہندو کو ہندو رہنے دیا جائے، مسلمان کو مسلمان۔ شاعر کو شاعر، سیاست دان کو سیاست دان۔ مگر قدرت انسان کو ایسے نہیں دیکھتی۔ کیوں کہ اس نے انسان کو کسی متعین لیبل سے باندھ کر نہیں رکھا۔ جیسا معاملہ کہ جانوروں کے ساتھ ہے۔ اس نے انسان کے اندر جو element of change یا تغیر پذیری کا جو Potential رکھا ہے وہی انسان کی خوب صورتی ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو انسان کے اندر ایک اضطراب کی کیفیت رکھتا ہے اور اس کو ہمیشہ زیر وز بر کرتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ میں بھی ایک مخصوص دنیا کا آدمی تھا۔ ادب کی دنیا، شعروں کی دنیا، میں نے اپنے آگے پیچھے ایک حصار کھینچ رکھا تھا۔ کچھ متعین ناموں اور شکلوں کا حصار، کچھ مخصوص الفاظ اور رنگ و آہنگ کا حصار۔ میرے سمع و بصر کچھ مخصوص آوازوں اور رنگوں کے عادی ہو چکے تھے۔ میری کتابی دل چسپیاں ایک متعین دائرے کے اندر ہی گردش کرتی تھیں اور میں یہ سمجھتا تھا کہ یہی ساری حقیقت ہے اور یہی ساری کائنات۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس مخصوص دائرے سے باہر نکل کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک کہ میری نظروں سے مولانا وحید الدین خان کی کچھ فکر انگیز کتابیں نہیں گزری تھیں۔ جنہوں نے میرے ذہن کے عقب میں کھلنے والے بند دروازوں پر مسلسل دستک دینا شروع کر دیا تھا۔

جیسا کہ ہمارے گھروں کا دستور ہے، بچپن میں، میں نے بھی مولوی صاحب سے درسِ قرآن لیا تھا جس کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں۔ مگر مذہبی کتابوں کے ساتھ ہمارا یہ عجیب وغریب رویہ ہے کہ ہم ان کا صرف لفظی درس لیتے ہیں۔ اس کے معنوی درس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ میں اپنے دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن

ایک ایسی مظلوم کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مگر سب سے کم سمجھی جانے والی ہے۔

زبانِ یارمن ترکی ومن ترکی نمی دانم

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں قرآنِ مجید کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے شاید ہی کوئی عربی زبان سیکھتا ہو۔ اس کے لیے زیادہ تر تراجم اور تفاسیر ہی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی وہی کیا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ منکشف ہوتا چلا گیا کہ یہ کتاب صرف مسلمان کے پڑھنے کی نہیں بلکہ انسان کے پڑھنے کی ہے۔ کیوں کہ یہ تو براہِ راست انسان سے مخاطب ہوتی ہے۔

O man! what has made you
careless about your Lord, the most
generous?
who created you, fashioned you
perfectly and gave you due proportion.
In whatever form He willed,
He put you together.

اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے ربِ کریم کی طرف سے
دھوکے میں ڈال رکھا ہے
جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تیرے اعضا کو درست کیا
پھر تجھ کو متناسب بنایا
جس صورت میں چاہا تجھ کو ترتیب دے دیا

O Man! verily you are returning
towards your Lord with your deeds
and actions, a sure returning.

اے انسان۔تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے
پھر اس سے ملنے والا ہے۔اپنے اعمال کے ساتھ

پھر میں نے دیکھا کہ جوں جوں میں اس کتاب کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں میری سوچ کا دھارا ایک نئی سمت کی طرف بہہ نکلا ہے۔ یہ واقعی بڑا عجیب وغریب تجربہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب تک جس یقین کے ساتھ میں زندگی گزار رہا تھا وہ خس وخاشاک کی طرح ہواؤں میں بکھرتا جا رہا ہے۔ جیسے ایک پرسکون گھپا میں رہنے والے درویش کو کسی نے گھسیٹ کر باہر کڑی دھوپ میں لا کھڑا کر دیا ہو۔ جیسے اونچے پہاڑ کی چوٹی سے دنیا کا نظارہ کرنے والے سیاح کو اچانک تیز آندھی نے اٹھا کر نشیب کی طرف پھینک دیا ہو۔ظاہر ہے کہ اس تجربے کے بعد مجھ جیسا بے مایہ انسان کیا کہہ سکتا ہے یا لکھ سکتا ہے۔ اس لیے ایک لمبی خاموشی ہی میرا مقدر تھی۔

اس تجربے کے بعد رہ رہ کر مجھے اس بات کا خیال آتا رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں آسمانی کتابوں کو ایسا درجہ نہیں دیتا جیسا کہ وہ انسانی کتابوں کو دیتا ہے۔حالاں کہ آسمانی کتابیں انسان کے لیے superior wisdom کا بہت بڑا source ہیں۔ وہ انسان کو ان اعلیٰ حقیقتوں کا پتہ دیتی ہیں جو انسانی فہم سے ماورا ہیں مگر جن کو انسان نظر انداز نہیں کر سکتا۔Confucius نے کہا تھا کہ:

There is nothig more real than
what cannot be seen
There is nothing more certain
than what cannot be heard

میرا خیال ہے کہ یہ اپنے آپ میں ایک مستقل موضوع ہے جس کا سنجیدگی سے تجزیہ ہونا چاہیے۔ میری رائے میں شاید اس کی سب سے بڑی وجہ مذہب کے تئیں انسان کا

عجیب وغریب رویہ ہے۔ دراصل مذہب، انسان ہونے کے ناطے انسان کا concern ہے۔ وہ کسی مخصوص انسانی گروہ، کلاس یا قوم کا مسئلہ نہیں ہے اور جس دن انسان یہ بات سمجھ لے گا اس کے مذہبی رویوں میں تبدیلی آنا شروع ہو جائے گی اور اس کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

بہر حال میں واپس اپنی کہانی کی طرف لوٹتے ہوئے یہ بتا دوں کہ ایسا بھی نہیں کہ اس کے بعد میں نے شاعری سے یکسر رشتہ توڑ لیا ہو۔ ہاں مگر یہ حقیقت ہے کہ پھر اس رشتے میں وہ گرمی، وہ حرارت نہ رہی۔ بہت کچھ لکھا ہوا ضائع ہو گیا۔ جو کچھ دریا بُر د ہونے سے بچ گیا وہی اس کتاب کے اوراق میں سمیٹا گیا ہے۔ بس اتنی سی کہانی ہے اس شعری مجموعے کی جسے پرتپال سنگھ بیتاب صاحب نے تیس چالیس سال کی شاعری پر محیط کہا ہے۔

دراصل اس بکھرے ہوئے بے ہنگم کلام کو جمع کرنے اور کتابی شکل میں شائع کرنے میں مجھ سے زیادہ میرے دوستوں کا ہاتھ رہا ہے۔ جن میں پرتپال سنگھ بیتاب، فاروق مضطر اور ڈاکٹر لیاقت جعفری پیش پیش رہے ہیں۔ انہی کے بار بار اصرار پر مجھے یہ مرحلہ طے کرنے کا حوصلہ ملا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام ہو۔ کیوں کہ ایک عرصہ ہوا میں نے کوئی غزل لکھی ہے اور نہ کوئی نظم۔ البتہ کبھی کبھار کچھ اچھوتے خیالات دماغ میں آجاتے ہیں۔ جنہیں میں مختصر دو دو شعروں میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً

وہ بانٹتا ہے ستارے بھی اور ظلمت بھی
کِھلا کے پھول ہوا میں اُڑانے والا ہے

کسی کو کچھ نہیں معلوم دشتِ حیرت میں
وہ کیا دکھاتا ہے اور کیا دکھانے والا ہے

کسی کو حاملِ ''اقراء''قرار دیتا ہے
کسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے
جہاں جہاں میرا وہم و گماں نہیں جاتا
وہاں وہاں سے وہ سورج نکال دیتا ہے

میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مستقبل میں، میں نے کوئی شعری مجموعہ چھاپنے کے بارے میں سوچا تو وہ شاید ایسے ہی دو دو شعروں والا مجموعہ ہوگا۔

غزلیں

میری آنکھوں میں آ، دل میں اُتر، پیوندِ جاں ہو جا
میں بے نام ونشاں ہوں تو مِرا نام ونشاں ہو جا

کبھی تو آخرِ شب پھول سا کِھل میرے آنگن میں
کبھی میرے نواحِ جسم میں خوشبوئے جاں ہو جا

تو میرے دشتِ حرف وصوت کو برگِ خموشی دے
تو میری آنکھ میں گم گشتۂ حیرت نشاں ہو جا

مگر یہ ذات کا بن باس کب تک بھوگنا ہوگا
کسی پربت کے پیچھے سے بُلا، کچھ مہرباں ہو جا

مِری راتوں کو قطرہ قطرہ شبنم بانٹنے والے
کبھی مانندِ دریا میری آنکھوں سے رواں ہو جا

وہ دیکھو کہکشاں سا اک جزیرہ منتظر اپنا
مجھے نیّا بنا اپنی، تو میرا بادباں ہو جا

❒

کٹے گا کیسے سفر یہ صحرائے ذات جیسا
تمہاری آنکھوں سے کچھ ملے التفات جیسا

ملا تو دریائے وقت کے پار ہی ملے گا
وہ میرے دن کی طرح ہے نا میری رات جیسا

میں ریت کی وادیوں کا پالا ہوا ہوں یارو
کہاں سے لاؤں خیال، آبِ حیات جیسا

نہ وہ پُرانی زمین پاؤں تلے ہمارے
نہ سر پہ سایہ ہے آسمانِ ثبات جیسا

کمال چہروں کی بھیڑ میں وہ نِگار صورت
جمال رنگوں کے بیچ رنگِ حیات جیسا

نہ کوئی گھٹنا ہماری آنکھوں میں اوس لائی
نہ کچھ دِکھائی دیا ہمیں واردات جیسا

گزر گیا کہ سفر کا حصّہ تھا وہ بھی آخر
ملا تھا ہم کو جو حاصلِ کائنات جیسا

کسے تھی احمدؔ شناس اپنے دکھوں سے فُرصت
کہاں سے ملتا کسی کو کچھ التفات جیسا

□

خدا کا جوہرِ وحدت، ضمیرِ لااِلہ دیکھا
وہ ہر موجِ نفس کے ساتھ مصلوبِ انا دیکھا

جو بھاری تھے اُنھیں پانی کے اوپر تیرتا دیکھا
خس و خاشاک کو گہرائیوں میں ڈوبتا دیکھا

جو دہکاتا رہا چنگاریاں سی میرے سینے میں
چھوا تو برف کے سنگین سانچے میں ڈھلا دیکھا

میں اپنے گھر کو واحد گوشۂ محفوظ سمجھا تھا
مگر خود کو یہیں دو چند خطروں میں گِھرا دیکھا

کتابیں اپنے سینوں سے لگا رکھی ہیں لوگوں نے
مگر لفظوں کو ہم نے شہر میں جلتا ہوا دیکھا

ابھی کچھ حسن باقی ہے ہماری آنکھ میں احمدؔ
کہ پتھر اُس نے پھینکا اور ہم نے آئینہ دیکھا

□

میں فتحِ ذات، منظر تک نہ پہنچا
مِرا تیشہ مِرے سر تک نہ پہنچا

اُسے معمار لکھا بستیوں نے
کہ جو پہلے ہی پتھر تک نہ پہنچا

تجارت دل کی دھڑکن گن رہی ہے
تعلق لطفِ منظر تک نہ پہنچا

شگفتہ گال تیکھے خط کا موسم
دوبارہ نخلِ پیکر تک نہ پہنچا

بہت چھوٹا سفر تھا زندگی کا
میں اپنے گھر کے اندر تک نہ پہنچا

یہ کیسا پیاس کا موسم ہے احمدؔ
سمندر دیدۂ تر تک نہ پہنچا

□

خواب میرا انتہائے آسماں پر رکھ دیا
اور دنیا میں مجھے انساں بنا کر رکھ دیا

اس کو یہ معلوم تھا کہ رات بھاتی ہے مجھے
ایک حصّہ اس لیے اُس نے منّور رکھ دیا

کشتیوں کو باندھ رکھا ہے کنارے پر کہیں
اور آنکھوں میں حسیں جھیلوں کا منظر رکھ دیا

جو پسِ دیوارِ معنی تھا وہ اُس کے پاس تھا
میرے حصّے میں فقط لفظوں کا جوہر رکھ دیا

اس زمیں پر ایک پرچھائیں لیے پھرتا ہوں میں
کیا خبر اس نے کہاں مجھ کو بنا کر رکھ دیا

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کنارہ ہی مجھے
اس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

اِس طرف حاجت کے موسم اور محرومی کے رنگ
اُس طرف دیوار کے خوابوں کا منظر رکھ دیا

کون آنکھوں کے لیے مانگے گا اشکوں کی دُعا
کس کی خاطر درد کا رشتہ بچا کر رکھ دیا

ریگزاروں کو دکھائیں پھول کی نیرنگیاں
پانیوں کے درمیاں کھیتوں کو بنجر رکھ دیا

میرے باہر دور تک پھیلی ہے پتھریلی زمیں
میرے اندر ایک انجانا سمندر رکھ دیا

وہ بھی احمدؔ تشنۂ تکمیل تھا میری طرح
روزِ اوّل ہی سے میرے ساتھ آذر رکھ دیا

❐

جسے دکھایا گیا تھا حرفِ کمال جیسا
وہی ہے آنکھوں میں آج خواب و خیال جیسا

میں اپنے لفظوں کو ٹوٹ کر چاہتا ہوں لیکن
یہاں تو میرا کمال بھی ہے زوال جیسا

میں تیرے دل میں گلاب جیسا کھِلا تھا لیکن
تیری زمیں پہ ہوں کس قدر پائمال جیسا

میں سامنے ہوں، وہ میرے اندر چھپا ہوا ہے
میں اُس کی تخلیق ہوں وہ میرے خیال جیسا

میں دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے دیکھتا ہے
میں سوچتا ہوں تو وہ مِرا ہم خیال جیسا

ہمارے بچّے بنائیں روشن نصیب کیسے
انہیں تو حیران کر گیا یہ سوال جیسا

لکھے گی تعلیم اک نیا اقتصاد گھر کا
نہال کردے گا دیکھنا نونہال جیسا

وہ نام مجھ کو ملا تھا احمدؔ دُعا کی صورت
رہے گا آنکھوں میں ساعتِ برشگال جیسا

□

دشتِ امید میں خوابوں کا سفر کرنا تھا
تُو، کہ اک لمحۂ ناپید بسر کرنا تھا

ہم نے کیوں آپسی اضداد کے نُکتے ڈھونڈے؟
ہم نے تو خود کو بہم شیر و شکر کرنا تھا

نقش بنتا ہی نہیں سنگِ سماعت پہ کوئی
کُند الفاظ کو پھر تیر وتبر کرنا تھا

ساعتِ درد، کہ بے چہرہ و بے نام رہی
قطرۂ اشک، کہ "محفوظِ گُہر" کرنا تھا

تشنگی ماہیِ بے آب سی لِکھ ہونٹوں پر
ورنہ یوں بوسۂ ساغر سے حذر کرنا تھا

مجھ پہ آیت نہ کوئی لفظ ہی اُترا احمدؔ
میری مشکل، کہ بیاں مجھ کو صِفر کرنا تھا

❐

جسم کے بیاباں میں درد کی دُعا مانگیں
پھر کسی مسافر سے روشنی ذرا مانگیں

کھو گئے کتابوں میں تتلیوں کے بال و پر
سوچ میں ہیں اب بچّے کیا چھُپائیں کیا مانگیں؟

زعفرانی کھیتوں میں اب مکان اُگتے ہیں
کس طرح زمینوں سے دل کا رابطہ مانگیں

ہم بھی ہو گئے شامل مصنوعی تجارت میں
ہم کہ چہرہ ساماں تھے اب کے آئینہ مانگیں

ورنہ عِلم ناموں کا اُٹھ نہ جائے دھرتی سے
آدمی پھلے پھولے، آؤ یہ دُعا مانگیں

اس سے پیشتر کہ یہ، رات موند لے آنکھیں
ننھے مُنے جگنو سے روشنی ذرا مانگیں

وہ صدائیں دیتا ہے آخری جزیرے سے
اور ہم نگاہوں کا حُسنِ اِبتدا مانگیں

کس کے سامنے رکھیئے کھول کر رضا اپنی
اور کس سے جادو کا بولتا دِیا مانگیں؟

□

میں مسافر افق تا افق دھوپ کے سنگ، فصلِ زمستاں کا لمحہ لیے
اور میرے تعاقب میں ہے تیرگی کوہساری ہمہ گیر سایہ لیے

اپنے چہرے کا ہر نقش ہر زاویہ ایک انبوہِ افراد میں بانٹ کر
میں کھڑا شہر کی ایک دوکان پر ہاتھ میں خالی از عکس شیشہ لیے

میں محافظ تھا جس زندگی کا اُسے لمسِ آواز سے بھی بچانا پڑا
ریت میں خامشی کی جھلستا رہا بند ہونٹوں میں دریائے قصّہ لیے

جب پہاڑوں سے اترے گی موجِ ہوا پھول سرسوں کے سارے بکھر جائیں گے
پھر کسی روز چپکے سے لوٹ آئے گا حرفِ وعدہ وفا برگِ تازہ لیے

لمحۂ آفرینش بکھرتا گیا ذات کا دائرہ تنگ ہوتا گیا
قبر کی اور احمدؔ ہے وہ جا رہا اپنے کاندھوں پہ اپنا جنازہ لیے

میں گُلِ امید ہوں دیدہ ور، مجھے دیکھنا
کہیں دور شاخِ خیال پر، مجھے دیکھنا

کبھی ساحلوں کی شفق فضاؤں کے درمیاں
سرِ شام کھوئی سی چشمِ تر، مجھے دیکھنا

کوئی لمحہ بھر کے لیے ہوں سرسوں کے کھیت میں
میں بھی تتلیوں کا ہوں ہمسفر مجھے دیکھنا

جو سمندروں سا وشال تیرا لگاؤ ہے
تو کسی جزیرۂ حسن پر مجھے دیکھنا

میں وہ آرزو کہ لہو برستا ہے آنکھ سے
میں وہ خواب ہوں کہ تو جاگ کر مجھے دیکھنا

نہ رُتوں کا لمحۂ واپسیں مجھے جان تُو
یہ سفر طویل ہے ٹوٹ کر مجھے دیکھنا

سرِ کوہسار ہے نام میرا لکھا ہوا
ابھی زیر ہوں تو ابھی زبر مجھے دیکھنا

□

سنا تھا تجھ سے اپنا نام تو ''شہ کار'' میں نے
''زمیں کا بوجھ'' لکھا خود کو آخر کار میں نے

میں خائف ہوں مِری تعداد بڑھتی جا رہی ہے
میں شرمندہ، نہ پالے جانور بسیار میں نے

نہیں پہچانتا اب آئینہ تصویر میری
مٹا ڈالے ہیں جیسے خود مرے آثار میں نے

دیا کس شوق سے ہستی کو میرا خواب تو نے
کیا کِس دل سے اپنے آپ کا انکار میں نے

پھر اُس کے بعد پتھر ہو گیا آنکھوں کا پانی
جب اپنے غم میں رونے سے کیا انکار میں نے

ہوا آتی نہیں صحرائے دل کی گھر میں احمدؔ
اٹھائی اِس طرح کچھ شہر کی دیوار میں نے

□

نہ جانے کس گھڑی بھر جائے پانی کشتیوں میں
بہے جاتے ہیں بس کے ناگہانی کشتیوں میں

گھروں تک جاتے جاتے لٹ چکے ہوں گے یہ انساں
کہ سڑکوں پر رواں ہیں زعفرانی کشتیوں میں

سمندر کے لبوں پر تھا خبر نامہ اُسی کا
زمیں لائی تھی جو تشنہ کہانی کشتیوں میں

کھُلیں آنکھیں تو پیڑوں پر ہوا مصلوب دیکھی
ہرا دیکھا نہ پھر حرفِ روانی کشتیوں میں

خدا وندا بدن کی آگ کے دریا ہزاروں
کئے ہیں پار کاغذ کی سہانی کشتیوں میں

شکستِ آخری ہوں سبز آوازوں کی احمدؔ
کہاں جاؤں گا پتوں کی خزانی کشتیوں میں

□

پسِ خیال ہوں کتنا ظہور کتنا ہوں
خبر نہیں کہ ابھی خود سے دور کتنا ہوں؟

یہی سطور ہیں میری کہ حرفِ باقی بھی
میں واہمہ ہوں کہاں تک ضرور کتنا ہوں؟

صدف کی کوکھ میں پلتا ہے زہر یا گوہر
نفس کی رات میں آنکھوں کا نور کتنا ہوں

بس ایک خط کہ تعلق کی دھوپ چھت پہ کھلے
بس اک اُڑان کبوتر کی ، دور کتنا ہوں؟

بس ایک گم شُدہ تتلی کا رنگ آنکھوں میں
بس ایک ساعتِ شب تاب، نور کتنا ہوں؟

کب آئینہ گرد گرد خوابوں کا صاف ہوگا
نہ جانے کس روز آخری انکشاف ہوگا

غبار ہو جائیں گے سبھی مرحلے سفر کے
غبار پھر سامنے کھڑا کوہ قاف ہوگا

اگ آئیں گی سر سے پاؤں تک ان گنت زبانیں
ہر اک زباں کا بیان تیرے خلاف ہوگا

گلِ صحارا کی تُند خوشبو کہاں سے آئی
فصیل میں شہرِ مُنقسم کی شگاف ہوگا

تمہاری قُربت کی وادیوں میں کسے خبر تھی
کہ اِک نئے زخم زار کا انکشاف ہوگا
سراب رشتوں کا گھیر لے گا شناسؔ مجھ کو
ہر ایک رخ پہ ہزار چہرہ غلاف ہوگا

❒

لفظوں کی پوشاک میں تھے انداز بہت
ورنہ عریاں تھی میری آواز بہت

آگاہی کی دھوپ میں کپڑے جھُلس گئے
سربستہ ہیں لیکن اب بھی راز بہت

میں قصّہ ہوں پھیلے ساگر کا مجھ کو
پی نا جائے لفظوں کا ایجاز بہت

لمس کہاں سے لائیں عمدہ ہاتھوں کا
پوشیدہ ہیں دل میں اب بھی ساز بہت

کھُل کر بات نہیں کرتے وہ بستی میں
بزدل ہیں احمدؔ اپنے جانباز بہت

وہاں سے آئے تھے لکھے ہوئے اصول بہت
یہاں پہ کھِلتے رہے ہیں انا کے پھول بہت

کبھی میں سارا ابو جہل ہی کا حصّہ تھا
کبھی کھِلے تھے میری ذات میں رسول بہت

نوید جو بھی ملی تھی لہولہان ملی
چھپے ہوئے تھے مِرے جسم میں ببول بہت

میں آپ جلتا رہا گھر میں روشنی کے لیے
وہ چاند تارے اُگاتا رہا فضول بہت

اسے بھی لگ گئی شائد ہوا سیاست کی
ذرا سی بات کو دینے لگا ہے طول بہت

خزاں خزاں تھا شگفتہ ساعتوں کا سفر
دھواں دھواں تھیں وہ آنکھیں وفا اصول بہت

وہ بانٹتا رہا لفظوں کا ذائقہ احمدؔ
ہمیں عزیز رہے کاغذوں کے پھول بہت

❑

تمھیں خبر تھی کہ تنہا سفر پہ جاؤں گا، ماں
لپٹ کے پھر کسی اپنے سے رو نہ پاؤں گا، ماں

میں تیری گود سے نکلا تو تیز تر تھی ہوا
میں تیرے ہاتھ مکمل کہاں سے آؤں گا، ماں؟

میں بات کرنے لگا تھا کہ لفظ گونگے ہوئے
لُغت کے دشت میں کس کو صدا لگاؤں گا، ماں؟

سُنے تھے تجھ سے عجب خواب قصّے مگر
میں رَت جگوں کی کہانی کسے سناؤں گا، ماں؟

تمہارے صحن کی خوشبو تمہارے گھر کا دیا
دہکتی ریت سے کیوں کر گلاب اُگاؤں گا، ماں؟

تو اپنے ساتھ زمیں کا پتہ بھی لیتی گئی
میں سیلِ آب میں خیمہ کہاں لگاؤں گا، ماں؟

وجود غارِ حرا سے کہیں طویل پڑا
نہ جانے کتنے برس بعد جگمگاؤں گا، ماں؟

نفس کے سانپ نے ماخذ تمام چاٹ لیے
میں زندگی کا تصّور کہاں سے لاؤں گا، ماں؟

□

حکایتِ ماسوا، کہ فصلِ کتاب ہوں میں
نقوش ونغمہ، کہ اک زیاں بے حساب ہوں میں

میں دشتِ خواہش میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
ہنوز دیکھا نہیں کسی نے، وہ خواب ہوں میں

میں تیری رنگت، جمال، خوشبو کا مجموعہ تھا
بس اب سلیٹوں پہ بنتا مٹتا گلاب ہوں میں

وجود کے آر پار لکھا سوال ہے تو
یہ واقعہ بھی عجب کہ، تیرا جواب ہوں میں

میں بارشِ سنگ میں بھی سنگِ وجود نکلا
نویدِ مُکتی کی جھوٹ تھی، کے حباب ہوں میں

یہاں تلک تو ہم آئے تھے ساتھ ساتھ لیکن
ندی کنارے کھڑا ہے تو، زیرِ آب ہوں میں

لگا کہ بس پَور پَور سیراب ہو چلا ہوں
کھُلا کہ احمدؔ شناس موجِ سراب ہوں میں

□

تو مجھ میں یوں رہے آنکھوں میں جیسے آنسو ہو
مِرے نواح میں بس تیرے غم کی خوشبو ہو

تیرا خرام مُیسر ہو میری راتوں کو
کہ میرے خواب جزیرے کی زندگی تُو ہو

میں جھِلملاتا رہا رات کی سیاہی میں
کہ جیسے دور کہیں جنگلوں میں جگنو ہو

تیرا جمال بھی بس ایک پل کی رونق تھا
تیرا خیال بھی جیسے کہ جستِ آہو ہو

بس ایک رات تُو میری سپردگی میں رہے
بس ایک رات مجھے زندگی پہ قابو ہو

یہ قُربتیں، کہ رگ و پے میں تیری گردش ہے
یہ فاصلے، کہ وہاں میں نہ ہوں جہاں تُو ہو

❒

دید میری آنکھوں کی بھول رہی ہے
سطحِ آب پہ سرسوں پھول رہی ہے

بے پایاں تھا موسم کا اک لمحہ
بیل ابھی دیوار پہ جھول رہی ہے

ہم خود کو پہچان نہ پائے اکثر
چہروں پہ لمحوں کی دھول رہی ہے

دن کا کاروبار جداگانہ تھا
رات اپنے غم میں مشغول رہی ہے

جانے لفظوں تک کس حال میں پہنچی
بات کہ جو دل میں معقول رہی ہے

اے فروغِ جسم تیرے ساتھ کیوں سایہ نہ تھا
میں کہ حاصل تھا جہاں کا اپنا ہم پایہ نہ تھا

یا خداوندا مِرے دستِ ہُنر نے کیا لکھا
اور اس تخلیق میں مجھ سا فرومایہ نہ تھا

بستیوں میں جابجا دیکھی ہے فصلِ تشنگی
پھول شائد ہوں وہاں، میرا جہاں سایہ نہ تھا

شعلگی کیسی تھی میرے نام کی یہ چارسو
درد میرا کیوں میرے آنگن میں کھل پایا نہ تھا

جستِ آہو سا وہ شاید ایک لمحہ تھا مِرا
میں کہ اپنے آپ سے تا عُمر مل پایا نہ تھا

وہ کتابوں میں نظر آتا مجھے احمدؔ کہاں؟
اعتبارِ لفظ جب آنکھوں میں بھر آیا نہ تھا

❐

نیند ہماری جاگ رہی ہے اور ہمارے خواب سفر
وقت کی اس جادونگری کا ہر منظر بیتاب سفر

واپس گھر جانے کا وعدہ اور شکستہ آوازیں
سوکھے پتے ٹوٹ رہے ہیں تنہا ہے مہتاب سفر

وہ اپنے الفاظ ہمیشہ میرے نام سے لکھتا ہے
یوں صدیوں سے جاری ہے امیدوں کا شب تاب سفر

اس نے مجھ سے میری ذات کا پورا حصّہ مانگا تھا
اور مجھے درپیش رہا ہے سانسوں کا گرداب سفر

لمحہ لمحہ ایک تغیّر ہے اندر کا موسم بھی
زخموں کو پر لگ جاتے ہیں اور سہانے خواب سفر

نفرت بھی ہے موج ہوا کی پیار کا رنگ بھی کچا ہے
دشمن بھی سب گردش میں ہیں اور سبھی احباب سفر

تھوڑی دیر کو چٹانوں میں گونجی تھی آواز مری
بیکل لفظوں کی شورش تھی جملوں کا بیتاب سفر

پھول کھلے ہیں سرسوں سرسوں آنکھیں بھیگی بھیگی ہیں
حدِ نظر تک بجھا بجھا ہے رنگوں کا شاداب سفر

سب سے پہلے تو نے میرے لفظوں کو مہکایا تھا
پہلی بار جگایا تو نے ان آنکھوں میں خواب سفر

میں بھی کوئی چہرہ سوچوں کوئی صورت اپناؤں
مہلت ہی کب دیتا ہے مجھ کو اتنی بیتاب سفر

انسانوں کی دنیا میں ہر درد اکیلا ہوتا ہے
رات کے سناٹوں میں ہوتا ہے تنہا مہتاب سفر

دھرتی والے کشتی کی تعمیر پہ ہنستے تھے احمدؔ
پھر رونے کی باری تھی جب آ پہنچا گرداب سفر

□

وہ اداسی میں گُم درد کی مستیاں بجھ گئیں آخرش
لمسِ شعلہ بھی کیا دے گیا انگلیاں بجھ گئیں آخرش

کوئی قصّے کہانی کا کردار ملتا نہیں اب یہاں
جگنوؤں کی پُراسرار سی بستیاں بجھ گئیں آخرش

تاج ایسے مجسم معانی کو دیمک سی کیا لگ گئی
سنگ خاموش گیتوں کی چنگاریاں بجھ گئیں آخرش

ایک سیلِ صدا تھا کہ پہچان گھر کی بہا لے گیا
اک بگولہ تھا کہ نام کی تختیاں بجھ گئیں آخرش

انسانوں کی دنیا میں ہر درد اکیلا ہوتا ہے
رات کے سناٹوں میں ہوتا ہے تنہا مہتاب سفر

دھرتی والے کشتی کی تعمیر پہ ہنستے تھے احمدؔ
پھر رونے کی باری تھی جب آ پہنچا گرداب سفر

□

وہ اداسی میں گُم درد کی مستیاں بجھ گئیں آخرش
لمسِ شعلہ بھی کیا دے گیا انگلیاں بجھ گئیں آخرش

کوئی قصّے کہانی کا کردار ملتا نہیں اب یہاں
جگنوؤں کی پُر اسرار سی بستیاں بجھ گئیں آخرش

تاج ایسے مجسم معانی کو دیمک سی کیا لگ گئی
سنگ خاموش گیتوں کی چنگاریاں بجھ گئیں آخرش

ایک سیلِ صدا تھا کہ پہچان گھر کی بہا لے گیا
اک بگولہ تھا کہ نام کی تختیاں بجھ گئیں آخرش

میرے چہرے کے آثار بھی کوئی چہرہ دکھاتا نہیں
آئینہ زار کتنی ہی رعنائیاں بجھ گئیں آخرش

جانے کب سو گیا تھا شناسؔ ایک اک شب گزیدہ پرند
رفتہ رفتہ شعا ریز شہنائیاں بجھ گئیں آخرش

❐

رشتہ زمیں کا چاند ستاروں سے جا ملے
جانے کسی کو تیری نگاہوں سے کیا ملے!

میں کہکشاں سے پار، تُو دریا کے اِس طرف
کیا جانے اب کہاں کوئی بچھڑا ہوا ملے

دیکھی ہے اِن فضاؤں میں آنکھوں کی اوس بھی
یوں بھی ملا ہے پیڑ، کہ جیسے خدا ملے

ہر دوسرے قدم پہ مجھے انتظار ہے
بجلی جھلک دِکھائے کہیں ذرا راستہ ملے

الفاظ ایک آن میں سُن ہو گئے تمام
حیرانیوں کا دُور تک اک سلسلہ ملے

ہونے کا اعتبار کھِلے پور پور میں
بانہوں کا تنگ دائرہ دستِ دُعا ملے

احمدؔ پھر ایک بار تمنا کا در کھُلے
نیندیں نہال ہوں جو کوئی خواب سا ملے

□

مجھے لکھا تھا تُو نے آخری ایجاد لمحوں کی
اُکھڑتی جا رہی ہے یا خدا بنیاد لمحوں کی

یہاں میری نفی سے میری ہر تصویر بنتی ہے
لکیریں ہیں یہ دیواروں پہ کِن فرہاد لمحوں کی؟

لہو منہ زور ہو جائے تو بندھن ٹوٹ جاتے ہیں
دُعا بن کر برستی ہے گھٹا آزاد لمحوں کی

سراب آسا ہمارے قہقہے ہیں کھوکھلے نغمے
سسکتی ہے در و دیوار میں فریاد لمحوں کی

صباحت شہر کی گلیوں میں ہم نے مشتہر کر دی
کہ سوداگر ہیں آنکھیں آئینہ برباد لمحوں کی

زمانہ لوٹ کر ڈھونڈے گا خود کو اِن خرابوں میں
امانت کی طرح محفوظ رکھنا یاد لمحوں کی

نئے پودے نہیں لیتے غذا بوڑھے درختوں سے
نئی فصلوں کو لہرائے ہوا آزاد لمحوں کی

میری تختی پہ جو اُبھرا تھا وہ کیا نام تھا احمدؔ؟
کہ پھر تحریر کی صدیاں تھیں گویا داد لمحوں کی

□

لمحہ لمحہ روز و شب کو دیر ہوتی جائے گی
یہ سفر ایسا ہے سب کو دیر ہوتی جائے گی

سبز لمحوں کو اُگانے کا ہُنر بھی سیکھنا
ورنہ اس رنگِ طلب کو دیر ہوتی جائے گی

اِس ہوا میں آدمی پتھر کا ہوتا جائے گا
اور رونے کے سبب کو دیر ہوتی جائے گی

دیکھنا تیرا حوالہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا
دیکھنا شعر و ادب کو دیر ہوتی جائے گی

رفتہ رفتہ جسم کی پرتیں اترتی جائیں گی
کاغذی نام و نسب کو دیر ہوتی جائے گی

عام ہو جائے گا کاغذ کے گلابوں کا چلن
اور خوشبو کے سبب کو دیر ہوتی جائے گی

سارا منظر ہی بدل جائے گا احمدؔ دیکھنا
موسمِ رخسار و لب کو دیر ہوتی جائے گی

□

جانکاری کھیل لفظوں کا، زباں کا شور ہے
جو بہت کم جانتا ہے وہ یہاں شہ زور ہے

باقی ہر رشتہ ہماری زندگی کا ہے اٹوٹ
ایک انساں کا تعلق ہے کہ بس کمزور ہے

اب کوئی تصویر آنکھوں میں نہیں ہے دیرپا
کیمرہ تبدیل کرتا سین کو فی الفور ہے

میری کیفیت سے بنتے ہیں زمیں کے خط و خال
میں جو اندر سے ہوا خالی تو باہر شور ہے

اُس کی تقریروں میں ہے جامِ شہادت کا نشہ
اور گھر میں زندگی کا خوبصورت مور ہے

لفظ کے صحرا میں معنی کا پرندہ تشنہ لب
کون بارش لائے گا کس کی دعا میں زور ہے؟

لفظ جب اُترا میری آنکھیں منوّر ہو گئیں
لفظ، احمدؔ زندگی سے رابطے کی ڈور ہے

□

پھولوں میں ایک رنگ ہے آنکھوں کے نِیر کا
منظر تمام تر ہے یہ فصلِ ضمیر کا

رشتہ وہ کیا ہوا مِری آنکھوں سے نِیر کا
مُدت ہوئی ہے حادثہ دیکھے ضمیر کا

پانی اتر گیا تو زمیں سنگلاخ تھی
تیکھا سا ہر سوال تھا رانجھے سے ہیر کا

تیری اذاں کے ساتھ میں اٹھتا ہوں پوچھتے
سر میں لیے ہوئے کوئی سجدہ اسیر کا

دیکھا نہ دوستوں نے عمارت کے اُس طرف
پوچھا کبھی نہ حال کسی نے فقیر کا

آئینہ گر پڑا تھا میرے ہاتھ سے کبھی
پھر یاد حادثہ نہیں کوئی ضمیر کا

صحرائے جسم روح کے اندر اتر گیا
اب کیا دکھائے معجزہ انساں ضمیر کا

آنسو کی ایک بوند کو آنکھیں ترس گئیں
اس دھوپ میں جھلس گیا دوہا کبیر کا

آدھا فلک کے پاس تھا آدھا زمین پر
میں ناتمام خواب تھا بدرِ منیر کا

پکے حروف گرد کی صورت بکھر گئے
سینے میں گھاؤ رہ گیا کچی لکیر کا

ہوتی رہیں گی بارشیں احمدؔ وصال کی
خالی رہے گا جام ہمیشہ فقیر کا

❐

نقش بر آب تھی ہر فصلِ طلب آنگن میں
ریت سے پھول اُگاتے رہے سب آنگن میں

پھر سرِ شام سرابوں کے بچھڑ جاتے ہی
بھر گئی ماہیٔ بے آب سی شب آنگن میں

گھر کسی خواب کی مشعل سے ابھی روشن ہے
دیدنی ہے ابھی امید کی چھب آنگن میں

سوئیاں بسترِ راحت پہ اُگ آئیں کیونکر؟
سائیگی دھوپ کا ایندھن ہوئی کب آنگن میں

چپ کے گرداب میں گھر ڈوب نہ جائے احمدؔ
خشک پتوں کی صدا تک نہیں اب آنگن میں

زمانہ ہو گیا ہے خواب دیکھے
لہو میں درد کا شب تاب دیکھے

مناظر کو بہت مدت ہوئی ہے
نگاہوں میں نیا اِک باب دیکھے

ستارہ شام کو جب آنکھ کھولے
اچانک چاند کو پایاب دیکھے

وہ چنگاری سی دے قُربت کی مجھ کو
تو پھر سورج کی آب و تاب دیکھے

کئی راتیں ہوئیں، کھڑکی میں گھر کی
تعلق کا نیا مہتاب دیکھے

میں لفظوں کی نئی فصلیں اُگاؤں
وہ سناٹوں کے تازہ خواب دیکھے

میری آنکھوں میں ساون رنگ بھر دے
مجھے اے کاش وہ سیراب دیکھے

نہ وہ آوارگی کا شوق احمدؔ
نہ کوئی دشت کو بیتاب دیکھے

☐

کوئی سرمایۂ جاں روگ سینے میں جگا دے
خداوندا مجھے کچھ میرے ہونے کا پتہ دے

میں اپنے غم میں جل کر راکھ ہوتا جا رہا ہوں
تو اپنے درد کی بوندوں سے پھر مجھ کو اُگا دے

یہاں ہر کوئی جیسے آپ ہی اپنا خدا ہے
مجھے اس شہر میں اللہ اکبر آسرا دے

میں آدھا ہوں میرے الفاظ بھی آدھے ادھورے
کسی خاموش لمحے میں مجھے مجھ سے مِلا دے

سجھائی کچھ نہیں دیتا وہ صاحب علم ہوں میں
تو اِقرا بول میری آنکھ سے پردہ ہٹا دے

نام خوشبو کی مانندِ ذات آئینہ
میں تحیّر، تیری بات بات آئینہ

ایک ایسا بھی موسم مجھے یاد ہے
زعفرانی زمیں، پات پات آئینہ

اک زمیں، تیرے آلام سات آسماں
ایک میں، تیرا احساس سات آئینہ

میرے چہرے سوالات بے انتہا
میرا حاصل شکستہ حیات آئینہ

میں کبھی تھا گلِ زخمِ صحرا نشیں
تُو کبھی تھا شبِ واردات آئینہ

نقش، چہرہ، شفق، آنکھ، نظارگی
ریگِ ساحل، محیطِ ثبات آئینہ

□

حفاظتوں کو بحال کر دے پناہ ایسی
جو جسم و جاں کو نہال کر دے نگاہ ایسی

اداس لمحوں، لطیف لہجوں میں وہ ملا تھا
نہ اجنبی تھا نہ آشنا، رسم و راہ ایسی

رگوں میں جلتے ہوئے ہزاروں چراغ دیکھے
ستارۂ شام سے ملی کچھ نگاہ ایسی

غبارِ راہ ہو گئے کتابوں کے پھول سارے
بیاں نہ پہنچا کسی طرح، بارگاہ ایسی

سوال پوچھے کسی سے نہ کوئی نام مانگے
خیال کرتے ہیں آؤ آپس میں چاہ ایسی

کنارِ دیدہ چمکتے موتی ملیں گے احمدؔ
کسی نے سانسوں کے نام لکھی ہے آہ ایسی

❒

اُس کی قدرت میں ہے وہ بارش کا لمحہ دیکھنا
وہ دکھا سکتا ہے پتھر میں بھی چہرہ، دیکھنا

اپنے بندھن سے کہاں تک بھاگ سکتا ہے کوئی
پانیوں کے سیل میں حدِ جزیرہ دیکھنا

وہ سوالوں کی حفاظت آپ کرتا ہے یہاں
حرمتِ انسان دیواروں پہ لکھا دیکھنا

اپنے چہرے پر جمی کائی کو دھو لینا کبھی
اپنی آنکھوں سے برستا کوئی لمحہ دیکھنا

اپنی آنکھوں کو کھُلا رکھنا نظاروں کے لیے
دشتِ دل کو صورتِ امکاں چمکتا دیکھنا

ایک سندیشہ سنائی دے گا پربت پار سے
ایک اندیشہ تہہِ دل میں سلگتا دیکھنا

دیکھنا احمدؔ شبِ تاریک میں گھر کا نشاں
چھت کے اوپر ایک جگنو سا چمکتا دیکھنا

□

اُس کی قدرت میں ہے وہ بارش کا لمحہ دیکھنا
وہ دکھا سکتا ہے پتھر میں بھی چہرہ، دیکھنا

اپنے بندھن سے کہاں تک بھاگ سکتا ہے کوئی
پانیوں کے سیل میں حدِ جزیرہ دیکھنا

وہ سوالوں کی حفاظت آپ کرتا ہے یہاں
حرمتِ انسان دیواروں پہ لکھا دیکھنا

اپنے چہرے پر جمی کائی کو دھو لینا کبھی
اپنی آنکھوں سے برستا کوئی لمحہ دیکھنا

اپنی آنکھوں کو کھُلا رکھنا نظاروں کے لیے
دشتِ دل کو صورتِ امکاں چمکتا دیکھنا

ایک سندیشہ سنائی دے گا پربت پار سے
ایک اندیشہ تہہِ دل میں سلگتا دیکھنا

دیکھنا احمدؔ شبِ تاریک میں گھر کا نشاں
چھت کے اوپر ایک جگنو سا چمکتا دیکھنا

□

اُس کی قدرت میں ہے وہ بارش کا لمحہ دیکھنا
وہ دکھا سکتا ہے پتھر میں بھی چہرہ، دیکھنا

اپنے بندھن سے کہاں تک بھاگ سکتا ہے کوئی
پانیوں کے سیل میں حدِ جزیرہ دیکھنا

وہ سوالوں کی حفاظت آپ کرتا ہے یہاں
حرمتِ انسان دیواروں پہ لکھا دیکھنا

اپنے چہرے پر جمی کائی کو دھو لینا کبھی
اپنی آنکھوں سے برستا کوئی لمحہ دیکھنا

اپنی آنکھوں کو کھُلا رکھنا نظاروں کے لیے
دشتِ دل کو صورتِ امکاں چمکتا دیکھنا

ایک سندیشہ سنائی دے گا پربت پار سے
ایک اندیشہ تہہِ دل میں سلگتا دیکھنا

دیکھنا احمدؔ شبِ تاریک میں گھر کا نشاں
چھت کے اوپر ایک جگنو سا چمکتا دیکھنا

❐

لُٹا رہا ہوں لہو کی طلب زمینوں میں
زمیں کے درد نے ڈھایا غضب زمینوں میں

ابھی یہ آنکھ کا موسم ہے ادھ کھلا شاید
ابھی حروف نہ کھلتے ہیں لب زمینوں میں

کسی کو راس نہ آئی یہاں کی آب و ہوا
کہ شادماں بھی ملے بے طرب زمینوں میں

عجب نہیں کہ سُلگتی رُتوں نے لکھا ہو
مہکتے پھول کا نام و نسب زمینوں میں

اب آدمی سے بڑی ہیں ضرورتیں اُس کی
اب اشتہار نے لُوٹا ادب زمینوں میں

میرے اصول کے پھولوں سے ماوریٰ اکثر
ملی ہے ریت بھی خوشبو نسب زمینوں میں

اُسی کے نام سے حرف و نوا کے دیپ جلے
اُسی کا درد ہے جانِ طلب زمینوں میں

طلوعِ صبح کو صدیاں گزر گئیں احمدؔ
ہے انتظار کی عادت عجب زمینوں میں

❑

پتھر کو یوں دیکھا جیسے ہیرا دیکھیں
ریگستان کے اندر خواب جزیرا دیکھیں

پاپ دھماکے میں ہم بھکتی ڈھونڈ رہے ہیں
میڈونا کے خط و خال میں میرا دیکھیں

کل کا جادو آج کو ممکن ہو جاتا ہے
بچے اب کِس کھیل کو خیرہ، خیرہ دیکھیں

کوئی آنکھ کا جگنو نا آواز کا دیپک
دل کا منظر تیرہ تیرہ دیکھیں

کِس سے مانگیں چنگاری اُس نام کی احمدؔ
کب تک لفظوں کا خاشاک ذخیرہ دیکھیں

تیری آنکھوں میں بھی پھر وہ سیدھا سادہ سچ نہ تھا
زندگی میں چند لمحوں سے زیادہ سچ نہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے لفظوں کی خوشبو اُڑ گئی
اک تماشہ تھا وہ تحریروں کا وعدہ سچ نہ تھا

جب تلاطم سانس کا اُترا تو تھا منظر کچھ اور
میں بھی خاصا جھوٹ تھا، تُو بھی زیادہ سچ نہ تھا

اپنی عریانی چھپانے کا حسیں اسلوب تھا
میں نے جو اوڑھا تھا لفظوں کا لبادہ، سچ نہ تھا

لہلہاتے ہم نے دیکھے تھے فقط خواب و خیال
لفظ موسم تھا، عنایت تھا کہ وعدہ سچ نہ تھا

مجھ کو اک فہرست ناموں کی وراثت میں ملی
میرے ساغر میں تھا جو مانندِ بادہ سچ نہ تھا

□

سوچ طائرِ خستہ دشتِ خواب گُم گشتہ
منجمد ہوا موسم آفتاب گُم گشتہ

باز گشت ماضی کی نا صدائے آئندہ
وقت، آسماں، انساں سب حساب گُم گشتہ

میں پناہ میں تیری نہ تُو آہ میں میری
پیار، قُربتیں، دُوری سب حساب گُم گشتہ

میری آنکھ میں روشن شعر کے افق کیا کیا
دل میں جھانک کر دیکھا جذب وتاب گُم گشتہ

بے نشاں ہے مدت سے آسماں تعلق کا
اور میری قوت کا وہ عقاب گُم گشتہ

آنکھ میں نہیں احمدؔ ایک بوند آنسو کی
رحم کی دعاؤں کا ہر خطاب گُم گشتہ

❑

ریزہ ریزہ اعتبارِ جسم و جاں ہو جائے گا
ایک دن یہ واقعہ وہم و گماں ہو جائے گا

ریت ہو جائیں گی ہاتھوں کی لکیریں دیکھنا
زندگی کا سُود بھی آخر زیاں ہو جائے گا

سارے اکشر ڈھیر ہو جائیں گے چپ کے روبرو
سائیں سائیں ایک ہنگامہ بیاں ہو جائے گا

ہر تعلق ٹوٹنے والا بنے گا اِس جگہ
شاخ سے لپٹا ہوا پتہ خزاں ہو جائے گا

میرے اندر منجمد ہے ایک لمحہ درد کا
دھوپ نکلے گی تو آنکھوں سے رواں ہو جائے گا

خواہشوں کی تتلیاں اڑتی پھریں گی دور تک
اور پھر یہ حوصلہ بھی ناتواں ہو جائے گا

قطرہ قطرہ دھوپ پی جائے گی پانی آنکھ کا
ہوتے ہوتے درد کا رشتہ بیاں ہو جائے گا

خود بخود شاخوں کے بندھن ٹوٹنے لگ جائیں گے
بال و پر کھولے تو پنچھی بیکراں ہو جائے گا

پھر دیارِ جسم میں لہرائے گا پرچم نیا
قافلہ سالار گردِ کارواں ہو جائے گا

کہکشاں رنگوں کی لہرائے گی احمدؔ کوئی دن
پھر شگفتہ جسم کا موسم دُھواں ہو جائے گا

لمس مانگیں خواب کا منظر کوئی چاہیں اداس
تتلیاں اڑتی ہیں آنگن میں کہ افواہیں اداس

دور تک پھیلی ہوئی سرسوں کے پس منظر میں ہم
اک بسنتی خواب دیکھیں کوئی رُت چاہیں اداس

ایک اک خاکہ ادھورا، رشتے، ناطے، دوستی
پھر وہی خالی سا حلقہ پھر وہی باہیں اداس

سہمگیں راتیں بِتانے کے لیے جائیں کہاں
دستکیں خاموش، گھر ویران، درگاہیں اداس

گھر سے جب نکلا تھا میں سرسبز تھیں پگڈنڈیاں
اب مِرے گھر کی طرف جاتی ہیں سب راہیں اداس

کیا دے گیا ہے سانستے پیکر میں ''کُن'' مجھے
لمحہ بہ لمحہ چاٹتا رہتا ہے گھُن مجھے

ہنسنے لگوں تو آنکھ میں آنسو اُتار دے
پتوں میں تُو بکھیر، درختوں میں بُن مجھے

اپنا خیال اوڑھ کے سوتا ہوں رات کو
پھر صبح کو جگاتی ہے اپنی ہی دُھن مجھے

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی سُن مجھے

میں ہی تو ایک حاصلِ خواہش ہوں اس جگہ
تو حُسنِ کائنات کے رنگوں میں چُن مجھے

نا شمارِ روز و شب میں نا عنایت میں کہیں
زندگی مجھ کو ملی اک آدھ ساعت میں کہیں

حسن اور سنگھار کے جوہر تو سارے بھر دیے
ہے توجہ کی کمی چہروں کی رنگت میں کہیں

اپنے پیچھے ایک بچّے کو سسکتا چھوڑ کر
دور جا پہنچے تھے ہم اندھی مسافت میں کہیں

وقت کے دریا میں ورنہ ہے فقط آبِ رواں
چند قطرے سرگراں گوہر کی چاہت میں کہیں

تو نے جو لکھا تھا وہ کردار جانے کیا ہوا
ڈھونڈتا ہوں خود کو میں اپنی حکایت میں کہیں

بدن تو ایک مُشتِ خاک سا ہے
یہ مجھ میں کون بے ارض و سما ہے

اسی کو حامئِ بنیاد لکھا
کہ جو بنیاد سے اُکھڑا ہوا ہے

مِری راہوں میں جگنو دیپ رکھ دے
مسافر راستہ بھولا ہوا ہے

ہزاروں تتلیاں آنگن میں اُتریں
نہ جانے گھر میں کون آیا ہوا ہے

ہزاروں رنگ دیکھے ہیں خوشی کے
مگر تخلیق کا لمحہ جُدا ہے

ادھوری لِکھ کے وہ میری کہانی
مِرے ہاتھوں مکمل چاہتا ہے

ملا تھا جو کبھی خوشبوئے جاں سا
وہ لمحہ دل کے اندر چُبھ رہا ہے

مٹانا چاہتا ہے کیا سمندر
ہوا نے ریت پر کیا لکھ دیا ہے؟

جو ہم نے آپ کو لکھا تھا دریا
تو ہم کو آپ نے پیاسا لکھا ہے

ہمیں جغرافیہ پڑھنا تھا احمدؔ
مگر تاریخ کا غم لگ گیا ہے

کچھ شفق ڈوبتے سورج کی بچا لی جائے
رنگِ امکاں سے کوئی شکل بنا لی جائے

حرف مہمل سا کوئی ہاتھ پہ اس کے رکھ دو
قحط کیسا ہے کہ ہر سانس سوالی جائے

شہرِ ملبوس میں کیوں اتنا برہنہ رہئیے
کوئی چھت یا کوئی دیوار خیالی جائے

ساتھ ہو لیتا ہے ہر شام وہی سناٹا
گھر کو جانے کی نئی راہ نکالی جائے

پھینک آنکھوں کو کسی جھیل کی گہرائی میں
بُت کوئی سوچ کہ آوارہ خیالی جائے

تِشنۂ زخم نہ رہنے دے بدن کو احمؔد
ایسی تلوار سرِ شہر اُچھالی جائے

میں طلسمِ منظر تھا جانے کتنے سالوں سے
کب دھوئیں کی بو آئی چاندنی خیالوں سے

میں سلگتا موسم تھا رنگِ سبز کیا رکھتا
لب چرا تو لائے تھے شاخِ لمس گالوں سے

کچھ نشاں دہی ہوتی ساحلِ دل و جاں کی
کچھ گُہر نما ابھرے ان صدف سوالوں سے

ہم نے کیسے جذبوں کی رِشتگی بُنی کیا کیا
موجۂ ہوا جیسے آنے جانے والوں سے

نقشِ رنگ و بو کوئی راہ میں نہیں احمدؔ
اُس کے گھر تلک پہنچوں اب کے کن حوالوں سے

تمام نقش و نگار حرف و نوا کی خوشبو
بدن سے لپٹی ہوئی ہے جیسے انا کی خوشبو

لٹا رہا ہوں میں لذتیں ممنوعہ شجر کی
وہ میرے اطراف پھونکتا ہے دُعا کی خوشبو

مجھے اڑاتی ہے رات خوابوں کی پالکی میں
مجھے جگاتی ہے صبحِ وعدہ وفا کی خوشبو

اسی نے مجھ کو شکست کا حوصلہ دیا ہے
جو اپنے بندوں میں بانٹتا ہے انا کی خوشبو

ہمارا آپس کا واسطہ بھی عجیب سا ہے
میں اک روایت گناہ کی وہ دَیا کی خوشبو

محبتوں کے چراغ راتوں کو بجھ گئے ہیں
ہوس کی بانہوں میں کھینچتی ہے بَلا کی خوشبو

وہ ذات کے ان کہے جزیروں سے بولتا ہے
میں خامشی کے سفر میں حرف و نوا کی خوشبو

میں جب نفی کی لکیر رشتوں پہ کھینچتا ہوں
تو پھوٹ پڑتی ہے درد سے آشنا کی خوشبو

میں جب بھی تشنہ لبی کا پیغام بھیجتا ہوں
تو وہ لفافوں میں بھیجتا ہے حِنا کی خوشبو

❑

اب تو ملتے ہیں سمندر بھی سرابوں جیسے
اب وہ انسان کہاں زندہ کتابوں جیسے

اب کے انسان کی بستی میں عجب موسم ہے
پیاس کے جام چھلکتے ہیں سحابوں جیسے

خطرہ لاحق ہے انہیں ریت کی دیواروں سے
ہیں مکاں والوں کے آثار خرابوں جیسے

میرے اندر ہے کوئی پیاس کا ساگر جیسا
اور یہ جسم کے دریا ہیں سرابوں جیسے

قصّہ رہ جائے گا کچھ آدھا ادھورا جیسا
اور ہم یونہی گزر جائیں گے خوابوں جیسے

چھو کے دیکھا تو کھنڈر ہو گیا میں اندر سے
خوش نظارہ تھے بہت، لوگ گلابوں جیسے

پھر کوئی مانگے دُعا غیر کی خاطر احمدؔ
پھر وہ موسم کھلیں بستی میں گلابوں جیسے

□

منکر ہوا تو ماننے والوں میں لکھ دیا
اُس بے نیاز نے مجھے ٹکڑوں میں لکھ دیا

چہروں کی نا تمام لکیروں میں لکھ دیا
اس نے مجھے خیال میں خوابوں میں لکھ دیا

سینچی میرے وجود میں لذت گناہ کی
پھر اس نے میرا نام گواہوں میں لکھ دیا

سرسوں کا ایک کھیت بھی رکھا پسِ نگاہ
رونے کا لطف بھی میری آنکھوں میں لکھ دیا

اُس نے میرے وجود کو الفاظ کیا دیے
میں نے تمام باب فقط "ہُوں" میں لکھ دیا

اُس نے سکھا دیا ہے سُلگنے کا فن مجھے
شعلے کا لمس چاندنی راتوں میں لکھ دیا

زرخیزیاں زمین کی جب بانجھ ہو گئیں
پھر اک گلاب ریت کے پردوں میں لکھ دیا

اتنے خلوص سے مجھے تعمیر تو کیا
میرا نصیب ٹوٹنے والوں میں لکھ دیا

سارا وجود موم کی صورت پگھل گیا
کیسا سوال جھیل سی آنکھوں میں لکھ دیا

احمدؔ میرے حروف ہواؤں کو سونپ کر
ایک اور نام آس لکیروں میں لکھ دیا

دھوپ کا موسم زمینوں کا مقدر ہو گیا
پیاس کچھ ایسی کہ ہر قطرہ سمندر ہو گیا

وہ نویدِ برگ و باراں کے پرندے اُڑ گئے
اور وہ قصّۂ غم آنکھوں میں پتھر ہو گیا

میں کہ لفظوں کے سفر کا آخری اعجاز تھا
ایک حرفِ رائیگاں میرا مقدر ہو گیا

یہ ضرورت کا سفر جانے کہاں لے جائے گا
چیز اونچی ہو گئی انسان کمتر ہو گیا

نوچ ڈالا آخری پردہ بھی ہم نے آنکھ سے
خواب عریاں ہو گئے بے کیف منظر ہو گیا

سوچتی ہی رہ گئیں آنکھیں کنارے پر کہیں
حُسن بالآخر حدِ امکاں سے باہر ہو گیا

ہم خریداروں کی اندھی بھیڑ میں گُم ہو گئے
بھاؤ جس کے ہاتھ میں تھا وہ سکندر ہو گیا

❒

قلم دفتر میں جب سے کاروباری ہو گیا ہے
کلاشنکوف کا دستور جاری ہو گیا ہے

تماشہ دیکھنا لوگوں کی عادت بن گئی ہے
ہمارے عہد کا ہیرو مداری ہو گیا ہے

اصولوں سے ہے ذاتی سا تعلق آدمی کا
جو پرچہ لازمی تھا اختیاری ہو گیا ہے

چبا جاتا ہے کچا آدمی غصّے میں آکر
سنبھل کے دوستو وہ شاکاہاری ہو گیا ہے

ہمارے گھر کا جگنو پھونک ڈالے گا مکاں کو
کہ اب یہ حادثہ قسمت ہماری ہو گیا ہے

مہاپُرشوں کے ہاتھوں میں امن کی پستکیں ہیں
مہا نگروں کا موسم شعلہ باری ہو گیا ہے

میں اپنے نام کے اکشر مٹاتا جا رہا ہوں
میری آنکھوں کا تارا اشتہاری ہو گیا ہے

سیاست دان نے کوزے میں رکھا ہے سمندر
وطن سے اب تعلق حلقہ واری ہو گیا ہے

یہ بوجھ اب ناتوانوں سے نہیں اُٹھنے کا احمؔد
کتابوں میں لکھا انصاف بھاری ہو گیا ہے

نظمیں

مجھے دیکھو

مجھے دیکھو وہی ہوں میں
کہ جب میرا خیال آیا تو دشتِ خواب میں جیسے طلوعِ گُل کا لمحہ تھا
وہ میرا لمسِ پا تھا کہ
تعلق کا فسوں جا گا
کہ سوز و ساز کے نغمے کھِلے دھرتی کے سینے میں
مجھے دیکھو وہی ہوں میں
کہ میرا نام لفظوں کے سفر کی آخری منزل
میری آنکھوں کے ننھے مُنھے جگنو
آ گہی کے چاند تارے
اور چہرہ ذات کی آیت

مجھے دیکھو وہی ہوں میں

ازل کی آرزو، حرفِ طلب، تخلیق کی غایت

مگراب میرے ہونے کی شہادت کس سے میں مانگوں؟

میرے ہاتھوں میں لاتعداد پرچم ہیں

مگر خود میرا پرچم ان میں غائب ہے

میری پہچان کا آئینہ جیسے گر گیا ہو میرے ہاتھوں سے

میرا چہرہ نہایت ٹکڑے ٹکڑے بٹ گیا ہے

خداوندا میرے چہرے کو یکجا کرنے والا اب تو ہی ہے

□

نفی کا خط

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب خالقِ جاں نے
مرے گھر میں بھی مہکایا تھا لمحہ آفرینش کا
وہ منظر میری آنکھوں میں ہمیشہ سے ہے بینش کا
حسیں اجلے کبوتر
آسمانوں سے نہ جانے کون سا پیغام میرے نام لائے تھے
اُفق تا بہ اُفق برسات تھی سرسوں کے پھولوں کی
میں انتر آتما تک حسن کے رنگوں میں ڈوبا تھا
سمندر سے چلی تھیں مژدۂ جاں لے کے آسودہ ہوائیں
کہ صحرائے بدن کا ذرّہ ذرّہ زعفراں زاروں کا منظر تھا
بڑی چاہت سے ہم نے جس محبت کو کبھی سینوں میں بویا تھا
اُسے پھولوں کی جیتی جاگتی سوغات جیسا آج پایا تھا

مجھے قسمت نے جیسے پھر سے آئینہ دکھایا تھا
وہ میری جان تھی یا میری آوازوں کا سایہ تھا
اُسے دیکھا تھا میں نے لمحہ لمحہ زندگی کی اور بڑھتے
سب کی آنکھوں میں ستارہ وار جلتے
قیام اُس کا، خرام اُس کا، کلام اُس کا
لکیریں ان گنت اثبات کے رنگوں سے کھینچی تھیں کسی فنکار نے جیسے
اسی فنکار نے پھر دل کے اندر ہاتھ ڈالا
اور اچانک کھینچ ڈالا سب لکیروں پر نفی کا ایک خط گویا
میں حیرت کے ہمالہ پر کھڑا تھا منجمد، تنہا
کہ دے کر چھین لینے کا تماشہ کس لیے تو نے بنایا تھا خداوندا

□

کاغذی کاشت

رتبہ و منزلت کی حسیں کہکشاں کا درخشاں ستارہ ہوں میں

فنِ جمہوریت سے تراشا ہوا میرا کردار ہے

اِس لیے مُفلسوں ناتوانوں کا واحد سہارا ہوں میں

ہے خوشامد سے نفرت مگر سائلوں کی سلامی ہوں میں

نام لکھا ہے مخصوص لوگوں میں لیکن عوامی ہوں میں

میرے دفتر کے دیوار و در روشنی میں نہائے ہوئے

جانکاری کی موٹی کتابوں کو دل سے لگائے ہوئے

رہنماؤں سے گہری عقیدت کا پرچم اٹھائے ہوئے

یہ جو ماحول میں نکتہ دانوں کے اقوالِ زریں کی مہکار ہے

میری دانشوری اور خلقِ خدا سے محبت کا اظہار ہے

میرا دستور ہے، کام ہی کام آرام تو ہے حرام

مجھے قسمت نے جیسے پھر سے آئینہ دکھایا تھا
وہ میری جان تھی یا میری آوازوں کا سایہ تھا
اُسے دیکھا تھا میں نے لمحہ لمحہ زندگی کی اور بڑھتے
سب کی آنکھوں میں ستارہ وار جلتے
قیام اُس کا، خرام اُس کا، کلام اُس کا
لکیریں ان گنت اثبات کے رنگوں سے کھینچی تھیں کسی فنکار نے جیسے
اسی فنکار نے پھر دل کے اندر ہاتھ ڈالا
اور اچانک کھینچ ڈالا سب لکیروں پر نفی کا ایک خط گویا
میں حیرت کے ہمالہ پر کھڑا تھا منجمد، تنہا
کہ دے کر چھین لینے کا تماشہ کس لیے تو نے بنایا تھا خداوندا

□

کاغذ کی کاشت

رتبہ ومنزلت کی حسین کہکشاں کا درخشاں ستارہ ہوں میں

فنِ جمہوریت سے تراشا ہوا میرا کردار ہے

اِس لیے مُفلسوں ناتوانوں کا واحد سہارا ہوں میں

ہے خوشامد سے نفرت مگر سائلوں کی سلامی ہوں میں

نام لکھا ہے مخصوص لوگوں میں لیکن عوامی ہوں میں

میرے دفتر کے دیوار ودر روشنی میں نہائے ہوئے

جانکاری کی موٹی کتابوں کو دل سے لگائے ہوئے

رہنماؤں سے گہری عقیدت کا پرچم اٹھائے ہوئے

یہ جو ماحول میں نکتہ دانوں کے اقوالِ زریں کی مہکار ہے

میری دانشوری اور خلقِ خدا سے محبت کا اظہار ہے

میرا دستور ہے، کام ہی کام آرام تو ہے حرام

کام کرنا عبادت کے درجے میں ہے
بس یہی بات ہے کہ میری میز پر فائلیں لہلہاتی ہیں
دہقان کی کھیتیوں کی طرح
اپنے کھیتوں میں میں فصل کاغذ کی بوتا چلا آرہا ہوں
اور کاغذ ہی بس کاٹتا جا رہا ہوں

❒

حرمتِ جاں

میری زمیں کا غبار لمحہ
کہ جس کی مُٹھی میں روز و شب کے تمام نقش و نگار لگتے ہیں دھول جیسے
کہ جس کے آنگن میں زندگی کے لطیف موسم ببول جیسے
میری زمیں کا عذاب لمحہ
گلاب سانسوں میں زہر امکاں
کہ وقت محبوس اور در و دیوار پہ لکھے ہوئے ہیں اس کے اصول جیسے
میری زمیں پر بلال آسا اذاں کی ٹھنڈی لطیف بوندیں گریں تو گرد و غبار بیٹھے
افق افق سے تیری شہادت کا نقش ابھرے
فرازِ کوہ سے سفید اجلے کبوتروں کی قطار تازہ گلاب پھینکے
کہ جن کی خوشبو ہماری سانسوں میں حرمتِ جاں کا درد بھر دے

بس اِک بگُولا گھنے درختوں کے دل سے اٹھے
جو وقت کا حبس توڑ ڈالے
پھر ایک بستی خدا کی بن جائے گردشِ روز و شب کا عنواں

❐

کیا ہی اچھا ہوا گر ایسا ہو

روز اخبار دکھاتا ہے سکور
بس، مکاں، ریل دھماکے سے اُڑے
عورتیں، بچّے، جواں اِتنے مرے
اب کے انساں کو یہ کھیل بہت بھاتا ہے
اور اس کھیل کے نام کوئی اس سے سُنے
میری پہچان، میرا صوبہ، میری آزادی
چند لمحوں کو وہ اخبار کے صفحوں میں تہ و بالا ہوا

اور اُبھرا تو لگا کہ ابھی تخلیق ہوا ہو جیسے
اُس کی معصوم سی آواز آئی
کیا ہی اچھا ہو کہ اِک روز دھماکہ ہو بڑا

خاک ہو جائیں سبھی بعد ازاں پیدا ہوں
اچھے اچھے سے نئے چاہنے والے انساں
پل دو پل کو میرے چہرے پہ کھلی دھوپ طمانیت کی
جیسے کچھ کھویا ہوا مل جائے
جیسے اندر سے کوئی کہتا ہو
کیا ہی اچھا ہوا گر ایسا ہو
کیا ہی اچھا ہوا گر ایسا ہو

❐

لیڈی ڈائنا کی موت

ناتواں، مجبور، بے حرمت سے پیکر
اور اُن کے روندنے والے توانا
قطرہ قطرہ زہر انسانوں کا اپنی روح کے اندر سمو لینے کا وعدہ ہو
کہ سینوں میں چراغوں کی طرح روشن صباحت کا فسانہ
بھوک اور اِفلاس میں کھلتے ہوئے شاہکار انساں
اور دولت کے خدا نگِ زمانہ
کہ سانسوں کے سمندر میں یہی مدوجزر ہیں زندگی کا تانا بانا
مگر ہر ذی نفس کا اس سمندر میں سفینہ ڈوب جاتا ہے
کہ جب وہ وقت آتا ہے تو
محتاج و غنی، شاہ و گدا، حسنِ مجسم، روسیاہ سب ٹوٹ جاتے ہیں
کہ جیسے کوئی مٹی کا کھلونہ
کہ جب وہ واقعہ ہوتا ہے تو سب ایک ہو جاتے ہیں
لیڈی ڈائنا ہو یا کوئی مفلس شبانہ

❒

کشمیر

خداوندا مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ تو نے جس زمیں کا خواب دیکھا تھا
وہ میری سرزمیں ہے
کبھی جو اپنا جوہر تُو نے اس مٹی کے سینے میں چھپایا تھا
اُسی کا نام اب کشمیر کا منظر حسیں ہے
کبھی تو نے بھی شائد دیکھنا چاہا تھا خود کو
اِس لیے ان وادیوں کا ذرّہ ذرّہ آئینہ ہے
خداوندا مِرے حرف و بیاں کی کشتیاں
اس رنگ و کیفیت کے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ساگر میں آکر ڈوب جاتی ہیں
دکھائی تو نہیں دیتا مگر محسوس ہوتا ہے کہ تو کتنا حسیں ہے
خداوندا لہو میری رگوں میں برف سا محسوس ہوتا ہے
میں جب یہ سوچتا ہوں تو نے جنت کی فضاؤں سے کشیدہ یہ امانت مجھ کو سونپی تھی
کہ میرے جسم میں جو زہر گردش کر رہا ہے

اُس کی اندھی پیاس کے آگے
زمیں کے رنگ سارے ماند پڑتے جا رہے ہیں
سرِ بازار میں لفظوں کی حرمت بیچتا ہوں
اور شرمندہ نہیں ہوتا
درو روزن میں اپنے گھر کے اندر سے مقفل کر چکا ہوں
کہ اب اللہ اکبر کی شہادت سے مُعطر ، جان فزا اونچے چناروں کی ہوائیں
میرے دروازوں سے واپس لوٹ جاتی ہیں
خداوندا کسی ابلیس کے ہاتھوں سے پھر میں نے
خیانت کا نوالہ منہ میں ڈالا ہے
گھروں کے چاند تارے بُجھ گئے ہیں
اور اب ان بستیوں میں آگ کی لپٹیں ہیں شعلوں کا اجالا ہے
خداوندا میں حیراں ہوں
کہ میں نے تو کھُلے لفظوں میں اپنی ذات کا انکار لکھا ہے
مگر تیرے کرم کا سلسلہ میری زمیں پر آج بھی جاری وساری ہے

کشمیر

خداوندا مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ تو نے جس زمیں کا خواب دیکھا تھا
وہ میری سرزمیں ہے
کبھی جو اپنا جوہر تُو نے اس مٹی کے سینے میں چھپایا تھا
اُسی کا نام اب کشمیر کا منظر حسیں ہے
کبھی تو نے بھی شائد دیکھنا چاہا تھا خود کو
اِس لیے ان وادیوں کا ذرّہ ذرّہ آئینہ ہے
خداوندا مِرے حرف و بیاں کی کشتیاں
اس رنگ و کیفیت کے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ساگر میں آ کر ڈوب جاتی ہیں
دکھائی تو نہیں دیتا مگر محسوس ہوتا ہے کہ تو کتنا حسیں ہے
خداوندا لہو میری رگوں میں برف سا محسوس ہوتا ہے
میں جب یہ سوچتا ہوں تو نے جنت کی فضاؤں سے کشیدہ یہ امانت مجھ کو سونپی تھی
کہ میرے جسم میں جو زہر گردش کر رہا ہے

اُس کی اندھی پیاس کے آگے
زمیں کے رنگ سارے ماند پڑتے جا رہے ہیں
سرِ بازار میں لفظوں کی حرمت بیچتا ہوں
اور شرمندہ نہیں ہوتا
در و روزن میں اپنے گھر کے اندر سے مقفل کر چکا ہوں
کہ اب اللہ اکبر کی شہادت سے مُعطر، جان فزا اونچے چناروں کی ہوائیں
میرے دروازوں سے واپس لوٹ جاتی ہیں
خداوندا کسی ابلیس کے ہاتھوں سے پھر میں نے
خیانت کا نوالہ منہ میں ڈالا ہے
گھروں کے چاند تارے بُجھ گئے ہیں
اور اب ان بستیوں میں آگ کی لپٹیں ہیں شعلوں کا اجالا ہے
خداوندا میں حیراں ہوں
کہ میں نے تو کھُلے لفظوں میں اپنی ذات کا انکار لکھا ہے
مگر تیرے کرم کا سلسلہ میری زمیں پر آج بھی جاری و ساری ہے

ابھی تک موسموں پر زندگی کا کیف طاری ہے
ابھی تک سبزہ زاروں میں سہانی تتلیوں کے دل دھڑکتے ہیں
ابھی کھیتوں میں تیری آیتوں کے زعفرانی رنگ کھلتے ہیں

خداوندا تو میرا بند سینہ کھول دے
کہ اس کے اندر بھی گلابوں کی ہوا آئے
کبھی جو آخرِ شب مثلِ شبنم میری آنکھوں سے ٹپک جائے

□

بلاعنوان

لبیک شش جہات تسلیم پہاڑوں کا درختوں کا سلسلہ
بے آب و گیاہ ریت کے میدان
تخلیق نشاں، فصل، بہاریں
نقشہ تھا میرے درد کی جاگیر کا
بستی کہ صحارا سمندر کہ جزیرہ
وہ لمسِ تمنا کہ کھلا غار میں دروازہ محبت کا علم کا
وہ میرے شب و روز
کہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کڑی تھے
یہ جب کی بات ہے کہ جب آغازِ سفر میں نے کیا تھا
جب میری خموشی کو بھی امنّا و صدقنّا مِلا تھا
اب نعرۂ تکبیر کے اک خول میں ہے میرا بسیرا

ابھی تک موسموں پر زندگی کا کیف طاری ہے
ابھی تک سبزہ زاروں میں سہانی تتلیوں کے دل دھڑکتے ہیں
ابھی کھیتوں میں تیری آیتوں کے زعفرانی رنگ کھلتے ہیں

خداوندا تو میرا بند سینہ کھول دے
کہ اس کے اندر بھی گلابوں کی ہوا آئے
کبھی جو آخرِ شب مثلِ شبنم میری آنکھوں سے ٹپک جائے

❑

بلاعنوان

لبیک شش جہات تسلیم پہاڑوں کا درختوں کا سلسلہ
بے آب و گیاہ ریت کے میدان
تخلیق نشاں، فصل، بہاریں
نقشہ تھا میرے درد کی جاگیر کا
بستی کہ صحارا سمندر کہ جزیرہ
وہ لمسِ تمنا کہ کھُلا غار میں دروازہ محبت کا علم کا
وہ میرے شب و روز
کہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کڑی تھے
یہ جب کی بات ہے کہ جب آغازِ سفر میں نے کیا تھا
جب میری خموشی کو بھی امنّا و صدقنّا مِلا تھا
اب نعرۂ تکبیر کے اک خول میں ہے میرا بسیرا

جو راستہ باہر کا ہے وہ خوف کے پہرے میں دبا ہے
اب کوئی دیا صحن میں میرے نہیں جلتا
بھٹکا ہوا اب کوئی مسافر میری جانب نہیں آتا

❐

آیتوں کا دیدہ ور

روزِ اوّل سے یہ منظر دیکھتا آیا ہوں میں
کہ رات کا پردہ گرا کر
آسماں تیری شہادت کی ہزاروں کہکشاؤں کے دریچے کھول دیتا ہے
اور سورج ہے کہ تیری روشنی کا عہد لے کر روز مشرق سے نکلتا ہے
کہ پژمردہ زمیں کی وسعتوں میں خواہشوں کی نت نئی فصلیں اُگاتا ہے
توانائی کا حرفِ انتہا شاہکارِ طاقت ہے
مگر تیری رضا کی طے شُدہ راہوں پہ چلتا ہے
کہ اُس کے پاس اپنا کوئی حیلہ ہے نہ حُجت ہے
میں سب کچھ دیکھتا ہوں اور آنکھیں موند لیتا ہوں
میں سب کچھ جان کر اپنی جہالت کے
حسیں گُنبد کی آوازوں پہ مرتا ہوں

خداوندا میں تیری آیتوں کا دیدہ ور اپنی انا کے ساتھ رہتا ہوں
روزِ اوّل سے یہ منظر دیکھتا آیا ہوں میں
کہ چلچلاتی دھوپ کے لمبے سفر میں
دور تک پھیلے ہوئے چھتنار پیڑوں نے مجھے ممتا کی صورت ڈھانپ رکھا ہے
سنگریزے پاؤں میں چُبھنے لگے تو سبزہ زاروں نے
حسیں مخمل کی چادر سی بچھا دی میری راہوں میں
صباحت آشنا میری نگاہوں کے لیے تو نے ہمیشہ رنگ و بو کا جادوئی منظر سجایا ہے
معطّر، جاں فزا ٹھنڈی ہوائیں میری سانسوں کی غذا بنتی رہی ہیں
مگر میں ہوں کہ پھر بھی منحرف ہوں
دل و جاں کو نفس کی آگ کا ایندھن بناتا ہوں
کہ اپنی ذات کا ہر المیہ چپ چاپ سہتا ہوں
خداوندا میں تیری آیتوں کا دیدہ ور اپنی انا کے ساتھ رہتا ہوں
روزِ اوّل سے یہ منظر دیکھتا آیا ہوں میں
کہ کس طرح تیری ہوائیں

صاف نیلے آسماں پر بادلوں کا ایک انجانا سمندر کھینچ لاتی ہیں
برسنے کا حسین اسلوب بارش کو سکھاتی ہیں
کسی درویش لمحے کی دُعا جیسی یہ تیری برف کی شفاف چادر
جو زمیں کے عیب سارے ڈھانپ لیتی ہے
نشیبی وادیوں میں جو ہمیشہ زندگی کے خوبصورت رنگ بھرتی ہے
کہ جن کو دیکھ کر حیرت کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
یہ تیرا درد ہے جو خود کو دریاؤں کی صورت آبشاروں میں لُٹاتا ہے
زمیں کی پیاس کی خاطر سمندر کو سدا البریز رکھتا ہے
کبھی یوں میری شریانوں میں تیری چاندنی کے لمس کا خاموش لاوا پھوٹ پڑتا ہے
پگھل جائے گا جیسے جسم میرا موم کی صورت
میں سجدہ ریز ہو کر ڈھیر ہو جاؤں گا اشکوں میں
مگر جانے پسِ دیوارِ پیکر کون سُولی کی طرح پیوست ہے مجھ میں
میں جھکنا چاہتا ہوں تو مجھے جھکنے نہیں دیتا
میں رونا چاہتا ہوں تو مجھے رونے نہیں دیتا

ں جب بھی ڈوبنے لگتا ہوں
نکھوں کے کسی شاہکار لمحے کے تلاطم میں
بھر آتا ہے میرا نقش پھر تنہا جزیرے کی طرح جیسے سمندر میں
گرچہ تیری آوازوں پہ اکثر ٹوٹ کر لبیک کہتا ہوں
مگر ہر بار واپس ذات کی نیرنگیوں میں لوٹ آتا ہوں
خداوندا میں تیری آیتوں کا دیدہ ور اپنی انا کے ساتھ رہتا ہوں

❐

متفرقات......!